رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۳۰

شوال المکرم ۱۳۷۰ھ　　　　جلد ۳۶　　　　عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

قیمت سالانہ چھ روپے　　　　اس پرچہ کی قیمت بارہ آنے

فہرست مضامین

ماہ محرم وصفر ۱۳۶۳ھ (جنوری وفروری ۱۹۴۴ء) جلد ۲۴- عدد ۱ و ۲

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۲
تفہیم القرآن	"	۱۵
مقالات:		
قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے؟	"	۳۵
خطبۂ تقسیم اسناد	"	۶۱
رسائل ومسائل:-		
ڈارون کا نظریۂ ارتقاء	"	۷۱
نواقض وضوء	"	۷۶
آلات کے ذریعہ توالد وتناسل	"	۷۹
مشینی امامت	"	۸۱
پیشۂ وکالت اسلامی نقطۂ نظر سے۔	"	۸۳
عالمانہ جاہلیت	"	۸۴
کاسب حرام کے ساتھ معاشی تعلقات	"	۸۵
اسلام اور آلات موسیقی	"	۸۶
اشتراکیت کا مقابلہ	"	۸۸
مطبوعات	ن- م	۸۹

"جماعت اسلامی کے اجتماعات کا آخری صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں"

(سید ابوالاعلیٰ مودودی نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام متصل پٹھانکوٹ سے شائع کیا)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

اشارات

قاعدے کی بات ہے کہ انسان تیاری اُس مقصد کی مناسبت ہی سے کیا کرتا ہے جو اس کے پیش نظر ہو۔ تیاری بجائے خود کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی مقصد کے لیے ہوتی ہے۔ مقصد کی نوعیت ہی اس کی نوعیت معین کرتی ہے، مقصد کی وسعت یا محدودیت کے لحاظ ہی سے اس کا پیمانہ وسیع یا محدود ہوتا ہے، اور مقصد ہی کا تقاضا تیاری کے ممکن طریقوں میں سے مناسب تر طریقے کا انتخاب کرتا ہے۔ بسا اوقات مختلف مقاصد کے لیے بڑی حد تک ایک ہی طرح کی تیاریاں کرنی پڑتی ہیں کیونکہ ان میں سے ہر مقصد کے لیے وہ ناگزیر ہوتی ہیں، لیکن اس ظاہری مماثلت کے اندر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے کہ مختلف مقاصد کی ملتی جلتی تیاریوں میں بھی ہر مقصد کی روح اپنی جداگانہ شان کے ساتھ کارفرما ہوتی ہے، اور ابتدائی مرحلوں سے گزر کر تکمیلی مراحل جتنے جتنے قریب آتے جاتے ہیں ان تیاریوں کے راستے بالکل ایک دوسرے سے الگ اور دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر دیکھیے، اسلحہ سازی ایک قسم کی تیاری ہے۔ آپ خواہ کسی غرض سے اسلحہ بنائیں، بہرحال صنعت کے چند طریقے آپ کو وہی اختیار کرنے ہوں گے جو کسی دوسری غرض کے لیے اسلحہ بنانے والا اختیار کرے گا۔ لیکن ابتدا ہی سے وہ مقصد جس کے لیے آپ اسلحہ بنا رہے ہیں، آپ کی اس تیاری کے پیمانے اور اس کی نوعیت اور اس کے مناہج کو ان دوسرے لوگوں کی تیاریوں سے مختلف کر دے گا جو دوسرے مقاصد کے لیے یہی کام کر رہے ہوں۔ فرض کیجیے، آپ صرف ایک فن لطیف (فائن آرٹ) کی حیثیت سے خوبصورت اسلحہ تیار کرنا چاہتے ہیں جس سے آپ کا مقصد محض اپنے اور اپنی سی ذہنیت رکھنے والوں کے ذوقِ جمال کو تسکین دینا ہے، ایک

دوسرا شخص پیشہ ور اسلحہ ساز ہے، اور ایک تیسرا شخص اس لیے اسلحہ بناتا ہے کہ اسے ایک فوج تیار کرنی ہے اور ان ہتھیاروں سے خود اپنا جنگی مقصد حاصل کرنا ہے۔ ان تین مختلف مقاصد کے لیے آپ اور وہ دونوں اسلحہ سازی کے بہت سے مشترک طریقے اختیار کریں گے، لیکن تینوں کے مقاصد کا اختلاف پہلے قدم ہی سے تینوں کی راہیں الگ کر دے گا اور تکمیلی مراحل کی طرف جتنا جتنا قدم بڑھے گا یہ راہیں ایک دوسرے سے بعید اور بعید تر ہوتی چلی جائیں گی۔

فن لطیف ہونے کی حیثیت سے آپ جو اسلحہ سازی کریں گے اس میں آپ کے پیش نظر نفیس نفیس تلواریں اور بندوقیں بنانا بجائے خود مقصود ہوگا، کسی دوسرے مقصد کے لیے ان کو آلہ و ذریعہ بنانے کا کوئی سوال نہ ہوگا۔ آپ کی نگاہ میں اصل اہمیت اسلحہ کی نفاست، خوشنمائی اور ستھرائی کی ہوگی، خواہ وہ کارزار میں اپنی کاٹ اور مار کے اعتبار سے بالکل ہی ناقص کیوں نہ ثابت ہوں۔ آپ اسلحہ سازی کے طریقوں میں سے اختیار صرف انہی طریقوں کو کریں گے جن سے لطیف ترین، نازک ترین حسین ترین ہتھیار بن سکیں اور عجائب دکھا کر ہر صاحب ذوق سے داد تحسین لیں۔ اُن طریقوں کی طرف تو نظر اُٹھا کر دیکھنا بھی آپ کو گوارا نہ ہوگا جن سے بھاری بھرکم، ہولناک اور بھیانک قلعہ شکن ہتھیار اور میدان مار اسلحہ بنا کرتے ہیں۔ آپ کی تلواریں اس لیے نہ ہوں گی کہ صفوں کو اُلٹ دیں بلکہ اس لیے ہوں گی کہ ہوا میں ریشمی رومال کاٹ دیں۔ آپ آتش بار اسلحہ آتش باری کے لیے نہیں بلکہ آتش بازی کے لیے بنائیں گے۔ آپ کی توپ اس لیے نہ ہوگی کہ میدان جیتے بلکہ اس لیے ہوگی کہ اس کا گولہ آسمان پر جا کر پھٹے اور رنگ برنگ کے پھول برسائے۔ پھر آپ کے اس کارخانے کی کشش بھی اُن خریداروں کو نہ کھینچے گی جنھیں لڑنے کے لیے ہتھیار درکار ہیں بلکہ کھینچے گی اُن خوش ذوق لوگوں کو جو لڑائی بھڑائی سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے محض آپ کی طرح آرٹ کے دلدادہ ہیں۔ وہ آپ کے بنائے ہوئے اسلحہ ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور انھیں خوبصورت غلافوں میں لپیٹ کر اپنے کمروں کی زینت بنائیں گے۔ بہت سے بہت اگر کوئی

کام انھوں نے ان ہتھیاروں سے لیا بھی تو بس یہ کہ کچھ نشانہ بازی کی مشق کرلی، کچھ تلوار کے ہاتھ صاف کر لیے، کبھی کوئی جانور مار لیا اور کبھی تماشائیوں کے مجمع میں پٹہ گری کے کمالات دکھا کر خراجِ تحسین وصول کر لیا۔

رہا پیشہ ور اسلحہ ساز، تو وہ اچھے سے اچھے اسلحہ بنا کر بر سرِ بازار رکھ دے گا کہ جس کا جی چاہے قیمت دے اور خرید لے جائے۔ اس کی تلوار اس کے اپنے کام کی نہ ہوگی، خریدار کے کام کی ہوگی۔ وہ اس پر بار دھ رکھے گا اور خریدار اس کی کاٹ سے فائدہ اٹھائے گا۔ ہر قسم کے خریداروں کی ضروریات کے لیے اس کے کارخانے میں ہر قسم کے ہتھیار تیار ملیں گے۔ شکاری شکار کے لیے، ڈاکو ڈاکہ زنی کے لیے، جہانگیر کشور کشائی کے لیے، مجاہد راہِ خدا میں جہاد کے لیے، غرض ہر ایک اپنے مقصد کے لیے وہاں سے ہتھیار پائے گا۔ وہ خود کسی مقصدِ خاص کا خادم نہ ہوگا بلکہ مقاصد دوسروں کے ہوں گے اور وہ سب کا یکساں خادم ہوگا۔ اس بے مقصد اسلحہ سازی کا اثر لازماً صنعتِ اسلحہ کے طریقوں پر بھی پڑے گا۔ فن کے معلوم و معروف طریقے تو پوری مہارت کے ساتھ اس کارخانے میں استعمال کیے جائیں گے، لیکن کارزار میں کام آنے کے لیے اسلحہ میں جن عملی خصوصیات کی ضرورت ہوتی ہے انھیں پیدا کرنے کا طریقہ اس پیشہ ور فن کار کو سرے سے معلوم ہی نہ ہوگا۔ اس کا حال وہی ہوگا جو گذشتہ جنگِ عظیم میں امریکہ کے اسلحہ ساز کارخانوں کا تھا کہ بازار کے چلتے ہوئے اسلحہ تو وہ خوب بنا سکتے تھے مگر کارزار کے عملی تجربوں سے جنگ آزما قوموں نے اسلحہ سازی میں جو کمالات پیدا کیے تھے ان کی ہوا تک ان پیشہ ور اسلحہ سازوں کے ہاں کو نہ لگی تھی۔ جیسا کہ مسٹر لائڈ جارج نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے، امریکہ کے اسلحہ اپنی چمک دمک اور شان اور نفاست سے نگاہوں کو خیرہ کرتے تھے مگر میدان کی امتحان گاہ میں ناکام ثابت ہوتے تھے۔

بخلاف اس کے جو شخص اسلحہ اس لیے بناتا ہے کہ اس کے پیشِ نظر ایک جنگی مقصد ہے جس کے لیے وہ اپنی فوج کو اپنے ہی ہتھیاروں سے مسلح کرنا چاہتا ہے، اُس کا معاملہ آپ کے اور اُس پیشہ ور اسلحہ ساز کے معاملہ سے قطعاً

مختلف ہوگا۔ ڈھلائی اور صیقل گری اور آتش کاری کے ابتدائی اصول اس کے ہاں بھی وہی ہوں گے جو آرٹسٹ اور پیشہ ور کے ہاں ہوں گے، مگر ان کا استعمال اس کے ہاں بالکل مختلف طور پر ہوگا۔ اس کو اسلحہ کی نفاست و خوشنمائی کی اتنی پروا نہ ہوگی جتنی ان کی کاٹ اور مار کی ہوگی۔ کوئی ہتھیار چاہے کتنا ہی خوشنما ہو، اگر میدان کی آزمائش میں پورا نہ اتر سکے تو وہ اس کے کسی کام کا نہ ہوگا، البتہ بھونڈے سے بھونڈا ہتھیار بھی جو اس آزمائش میں پورا اتر سکے اُس کی نظر میں نہایت پسندیدہ ٹھیرے گا۔ اسے مظہر العجائب ہتھیاروں کی حاجت نہ ہوگی، بس کارگر ہتھیار مطلوب ہوں گے۔ اسے وہ توپ درکار ہوگی جس کا گولہ قلعوں کو پاش پاش کر دے چاہے اس سے پھول ایک بھی نہ جھڑے۔ اسکو وہ تلوار مرغوب ہوگی جو دشمن کے اندر دوش تا کمر اتر جائے چاہے چمک کا نام بھی اس میں نہ ہو اور ہوا کے رواں کا ایک تار بھی نہ کاٹ سکے۔ ان خوبیوں کے ساتھ اگر ستھرائی اور نفاست و خوشنمائی بھی ہو تو کیا کہنے مگر مقابلۃً وہ کارگر مگر بھونڈے ہتھیار کو حسین ترین مگر کُند ہتھیار پر ہزار درجہ ترجیح دے گا۔ پھر وہ صناعتِ اسلحہ سازی کے معلوم و متعارف طریقوں کا بھی غلام نہ ہوگا بلکہ میدان کے تجربوں پر انھیں پرکھے گا اور ان تجربات کی روشنی میں اصول صناعت کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقوں سے استعمال کرنے کی کوشش کرے گا خواہ وہ فن کے مروجہ طریقوں کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ پھر اس کا مقصد ہی یہ تعین کرے گا کہ صناعتِ اسلحہ سازی کے اصول پر جن جن اقسام کے ہتھیار بننے ممکن ہیں ان میں سے وہ کس قسم کے ہتھیار بنائے اور کس قسم کے نہ بنائے۔ بہت سے وہ ہتھیار جو فنِ لطیف کی اغراض کے لیے یا پیشہ ور کی دکان کے لیے عین مطلوب ہیں، سرے سے اس کے کارخانہ کی اسکیم میں جگہ ہی نہ پائیں گے، اور بہت سے ان ہتھیاروں کو اس کے ہاں سر فہرست جگہ ملے گی جنھیں بنانے کی ضرورت نہ فن کار محسوس کرتا ہے نہ پیشہ ور۔ پھر وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کا تصور تک نہ کر سکے گا کہ اپنے بنائے ہوئے ہتھیار اپنے دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے۔ فن کار اپنے فن میں مگن ہوتا ہے، اس کا کسی کارزار سے تعلق ہی نہیں ہوتا کہ کوئی اس کا دوست یا دشمن ہو۔ پیشہ ور ہر خریدار کا نیازمند ہوتا ہے، اس کو اس سے کیا بحث کہ خریدنے والے اس کا بنایا ہوا مال کس غرض سے خرید رہے ہیں۔ مگر یہ جنگ آزما اسلحہ ساز تو میدان میں دوست بھی رکھتا ہے اور

دشمن بھی، اس کے لیے تو نا ممکن ہے کہ اپنا ایک تیر بھی دشمن کے ترکش میں جاتا دیکھ سکے۔ جب اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کا کارخانہ دشمن کے ہاتھ پڑ کر اس کے لیے اسلحہ بنائے گا تو وہ اُسے خود اپنے ہاتھ سے ڈائنا میٹ لگا کر اڑا دیتا ہے اور اس بات کی کچھ پروا نہیں کرتا کہ میں نے برسوں کی محنت اور اربوں روپے کے صرف سے یہ کارخانہ بنایا تھا۔

جس طرح اسلحہ سازی ایک قسم کی تیاری ہے اسی طرح تزکیۂ نفس بھی ایک قسم کی تیاری ہی ہے۔ تزکیہ کے دو معنی ہیں، پاک صاف کرنا اور نشوونما دینا۔ ان دونوں معنوں کے لحاظ سے تزکیۂ نفس کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو غیر مطلوب صفات سے پاک کیا جائے اور مطلوب صفات کی آبیاری سے اس کو پروان چڑھایا جائے۔ پس درحقیقت تزکیۂ نفس اور اخلاقی تیاری دونوں ہم معنی ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جس طرح دوسری تمام تیاریوں کے معاملہ میں "تیاری بجائے خود" ایک مہمل چیز ہے اسی طرح یہ اخلاقی تیاری بھی بذاتِ خود مہمل ہے تاوقتیکہ یہ بات واضح طور پر معین نہ ہو کہ تیاری کس مقصد کے لیے ہے۔ مقصد ہی اس امر کا فیصلہ کرنے والی چیز ہے کہ کونسی صفات اس کے حصول میں مانع ہیں جن سے نفس کو پاک کیا جائے اور کونسی صفات اس کے حصول میں مددگار ہیں جن کو نشوونما دینے کی سعی کی جائے۔ مقصد ہی اس بات کا تعین کرتا ہے کہ کس پیمانے کا انسان درکار ہے جسے بنانے کی کوشش کی جائے اور کس پیمانے کے انسان غیر مفید یا ناکافی ہیں جن کے بنانے کی یا تو کوشش ہی نہ ہو، یا جن کے بن جانے پر اکتفا نہ کیا جائے۔ مقصد ہی کی نوعیت پر اس سوال کا فیصلہ بھی منحصر ہے کہ تزکیۂ نفس کے طریقوں میں سے کونسا طریقہ پیمانۂ مطلوب کے انسان تیار کرنے کے لیے مناسب تر ہے اور تزکیہ کی تدابیر میں سے کن کن تدبیروں کو کس تناسب کے ساتھ استعمال کیا جائے کہ اس پیمانہ کے انسان ڈھل سکیں۔

یہ مقصد کا سوال اس تزکیۂ نفس کے مسئلے میں اتنا اہم ہے کہ نہ صرف تزکیہ کی نوعیت اور اس کے پیمانے اور اس کی منہاج ہی کا اس پر انحصار ہے، بلکہ فی الحقیقت ایک قسم کے تزکیہ اور دوسری قسم کے تزکیہ میں فرق و امتیاز بھی

اسی کے لحاظ سے ہوتا ہے اور مختلف اقسام کے تزکیوں کی قدر و قیمت بھی اسی کی بنا پر مشخص کی جاسکتی ہے۔ بہت سے لوگ تزکیۂ نفس کو بجائے خود کوئی بہت بڑی قیمتی چیز سمجھتے ہیں اس لیے مقصد سے قطع نظر کرکے نفس تزکیہ کے پیچھے پڑ جاتے ہیں حالانکہ نفس تزکیہ محض ایک بے معنی چیز ہے۔ اسی طرح بہت سے ناواقف لوگ اس حالت سے دھوکا کھا جاتے ہیں جو مختلف مقاصد کے تزکیوں کی بعض مشترک تدابیر میں پائی جاتی ہیں۔ ایک بلند ترین اور صحیح ترین مقصد کے لیے جو طریقے کسی حکیم نے اختیار کیے تھے انہی طریقوں کو جب اس مقصد سے ہٹے ہوئے لوگ دوسرے پست یا غلط مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں تو دیکھنے والے طرح طرح کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے کہ جب یہ ان طریقوں کو استعمال کر رہے ہیں تو ضرور ان کا مقصد بھی وہی ہوگا جو اس حکیم کا تھا۔ کوئی گمان کرتا ہے کہ ان طریقوں کا استعمال بجائے خود محمود ہے قطع نظر اس سے کہ کسی مقصد کے لیے کیا جائے۔ اور کوئی بیچارہ سادہ لوح اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ پست اور غلط مقاصد کے لیے تزکیۂ نفس کرنے والے جب اس بڑے حکیم کے نسخے کی ترکیب اور اس کے تناسب میں ترمیم کرکے، اس کے بعض اجزاء کو نکال کر، بعض اجزاء کی مقدار بعض دوسرے اجزاء سے بڑھا کر اور بعض بظاہر مباح اجزاء اپنی طرف سے اس میں بڑھا کر اسے اپنے مقاصد کے لیے مناسب بناتے ہیں تو وہ غریب اس نئی ترکیب کے راز کو نہیں پاسکتا اور یقین لے آتا ہے کہ یہ نسخہ بھی صحیح ہے۔ حالانکہ اگر باضابطہ حکیمانہ طریقہ سے تزکیۂ نفس کے مسئلہ کا مطالعہ کیا جائے، مقاصد کے لحاظ سے تزکیوں کی انواع و اقسام میں امتیاز کیا جائے اور تدابیر تزکیہ کا اس اعتبار سے جائزہ لیا جائے کہ مختلف نوعیت کے تزکیوں میں بعض مشترک تدبیروں کا استعمال کس طرح مختلف طور پر ہوتا ہے، ہر نوعیت کے تزکیہ میں ان تدابیر کی روح دوسری نوعیتوں کے تزکیوں سے کس قدر مختلف ہوتی ہے، اور ان تدابیر کے تناسب کا تزکیہ کے مزاج میں کتنا دخل ہے، تو اس قسم کی ساری غلط فہمیاں ختم ہو جاتی ہیں اور حقیقت بالکل نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

اسلحہ سازی کی جو مثال ابھی ہم نے اوپر دی ہے اگر آپ اسے نظر میں رکھیں اور پھر اس مسئلہ پر غور کریں

تو سارا معاملہ بآسانی آپ کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ آپ اس مثال میں ہتھیار کی جگہ انسان کو رکھ دیں اور اسلحہ ساز کے مقام پر اس شخص کو رکھیں جو تزکیہ سے انسانوں کو تیار کرنا چاہتا ہے۔ لامحالہ یہاں بھی سب سے پہلے وہی سوال پیدا ہوگا جو اسلحہ سازی کے معاملہ میں پیدا ہوا کہ یہ شخص آخر کس غرض کے لیے انسان تیار کرنا چاہتا ہے؟ انسان سازی آرٹ کے نقطۂ نظر سے بھی ہو سکتی ہے، پیشہ ورانہ بھی ہو سکتی ہے، اس غرض سے بھی ہو سکتی ہے کہ آپ دنیا میں خود اپنی ایک اسکیم رکھتے ہیں اور اپنے تیار کیے ہوئے انسانوں کی طاقت سے اس کو جاری کر کے اپنے دنیوی مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اس غرض سے بھی ہو سکتی ہے کہ آپ دنیا میں خدا کی اسکیم کو جاری کر کے اس کی رضا کو پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان تمام مختلف اغراض کے لیے جو انسان سازی کی جائے گی اس میں بہت سی چیزیں مشترک ہوں گی مثلاً متعدد انسانی صفات ایسی پائی جائیں گی جنھیں سب یا اکثر انسان ساز دور کرنا چاہیں گے کیونکہ وہ ان سب کی یا اکثر کی جداگانہ اغراض کے حصول میں مانع ہوتی ہیں۔ اسی طرح متعدد صفات ایسی ملیں گی جنھیں وہ سب یا اکثر نشوونما دینے کے خواہشمند ہوں گے کیونکہ وہ ان کی الگ الگ غرض کے حصول میں مددگار ہوتی ہیں۔ اس طرح اخلاقی تیاری کی بہت سی تدبیریں بھی آپ ایک غرض کی انسان سازی میں وہی پائیں گے جو دوسری غرض کی انسان سازی میں پائیں گے۔ لیکن ان ظاہری مماثلتوں کے باوجود مختلف اقسام کی انسان سازیوں کے مزاج ایک دوسرے سے مختلف ہی رہیں گے اس لیے کہ غرض و مقصد کا اختلاف ان کے راستوں کو لازماً جدا کر دے گا۔ جن صفات کو غیر مطلوب سمجھنے میں یہ سب متفق ہوں گے ان کے غیر مطلوب ہونے کی وجہ ہر ایک کی نگاہ میں دوسرے سے مختلف ہوگی، ان کی غیر محبوبیت کے مراتب بھی سب کے ہاں یکساں نہ ہوں گے، اور ان کے سوا بہت سی صفات ایسی ملیں گی جو ایک کے ہاں سخت مذموم ہوں گی اور دوسرے کے ہاں صفاتِ مذمومہ کی فہرست میں سرے سے ان کا ذکر تک نہ ملے گا۔ پس نہ صرف یہ کہ مشترک صفاتِ مذمومہ کے مذموم ہونے میں ہر ایک کا نقطۂ نظر دوسرے سے مختلف ہوگا، بلکہ کلی حیثیت سے ایک کی صفاتِ مذمومہ کا مجموعہ دوسرے کے مجموعہ سے مختلف پایا جائے گا۔ یہی صورتِ حال صفاتِ مطلوبہ کے معاملہ میں آپ دیکھیں گے کہ صفات کے مطلوب ہونے کی وجہ میں یہ سب غیر متفق ہوں گے، ان

کے مراتب مطلوبیت و محمودیت میں بھی ان کے درمیان اتفاق نہ ہوگا اور ایک کی صفات مطلوبہ کا مجموعہ دوسرے کے مجموعہ سے نہ ملے گا۔ اسی طرح تدابیر میں آپ دیکھیں گے کہ مشترک تدابیر میں بھی ہر ایک کے ہاں دوسرے سے مختلف روح کار فرما ہوگی، ان کی اہمیت کے مدارج میں بھی اختلاف ہوگا، اور مجموعی حیثیت سے ایک کا نظامِ انسان سازی اپنی ترکیبِ اپنی تدابیر اور اپنی تدابیر کے تناسب میں دوسرے کے نظامِ انسان سازی سے بالکل غیر مشابہ ہوگا۔

انسان سازی اگرچہ نام کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہے، لیکن دیکھیے، غرض و مقصد کے اختلاف سے مختلف اقسام کے انسان سازوں میں کتنا بڑا اختلاف ہو جاتا ہے۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تزکیۂ نفس کے ان مختلف اسکولوں میں ہم فرق کیسے کریں گے اور کس طرح یہ تعیین کریں گے کہ ان میں سے کون محض آرٹسٹ ہے، کون پیشہ ور ہے، کون دنیا میں اپنی اسکیم چلانے کے لیے جدوجہد کرنا چاہتا ہے، اور کون خدا کی اسکیم جاری کرنے کے لیے سعی و عمل کے میدان میں اُترنا چاہتا ہے؟ یہ فرق و امتیاز ظاہر ہے کہ دو ہی طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ ہم ہر اسکول کے نظامِ تزکیہ کا جائزہ لیں۔ دوسرے یہ کہ ہم ہر اسکول کے طرزِ عمل کو دیکھیں۔

آرٹسٹ کا امتیازی وصف یہ ہوتا ہے کہ خوش ذوقی، حُسن، لطافت، کمالاتِ معنوی، ظہورِ عجائب، اور شاہدِ جمالِ معنوی اس کے نظام کی بنیادی قدریں ہوتی ہیں۔ اس لیے آرٹسٹ کے نقطۂ نظر سے تزکیۂ نفس کے جتنے اسکول قائم ہوں گے ان میں لازماً یہی چیزیں زیادہ نمایاں ہوں گی۔ ان کے ہاں صفاتِ مذمومہ کی فہرست اس لحاظ سے مرتب ہوگی کہ جو صفات آرٹ کے نقطۂ نظر سے جتنی زیادہ مذموم ہیں ان کے دور کرنے پر اتنا ہی زیادہ زور دیا جائے گا۔ طہارت، نظافت، آداب (ایٹی کیٹ)، اوضاع (فیشن) اور اسی نوعیت کی دوسری چیزوں میں مقرر ضابطوں سے معمولی انحراف کو بھی وہ بڑے معاصی میں شمار کریں گے۔ جن صفات سے ان کے نزدیک روح کی پرواز میں فرق آتا ہے، یا جو صفات لطائف کے کھلنے میں مانع ہوتی ہیں، یا جن سے کمالاتِ معنوی کا حصول نہیں ہو سکتا، وہ ان کے ہاں اصل

صفاتِ غیر محمودہ قرار پائیں۔ اسی طرح صفاتِ محمودہ میں بھی آپ اُن کی پوری فہرست پر آرٹ کو مسلط پائیں گے۔ آپ کو صریح طور پر محسوس ہوگا کہ ان کو زیادہ تر دلچسپی زندگی کے حُسن سے ہے اور اس سے آگے بڑھ کر اگر یہ کچھ چاہتے ہیں تو صرف وہ اخلاقی خوبیاں جن سے نفس میں لطیف قوتیں پیدا ہوں، عالمِ بالا کی طرف پرواز کی طاقت آئے، اور ماورائے مادہ لذتوں کے ادراک کی صلاحیت نشوونما پائے۔ گویا کہ وہ ایک نفیس ریڈیو سیٹ بنانا چاہتے ہیں جو نہایت عمدہ اور خوش وضع بھی ہو اور لطیف ترین آوازوں کو اخذ بھی کرلے، یا ایک خوب صورت کیمرا بنانا چاہتے ہیں جو ستھرا بھی ہو اور جس کی پلیٹ پر لطیف ترین صورتیں مرتسم بھی ہوسکیں۔ ان کے لیے دنیا میں کرنے کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جس کی خاطر انھیں خارج کی طاقتوں سے کشمکش اور مقابلہ پیش آئے، جس میں ذمہ داریوں کا بوجھ سہارنے کی طاقت درکار ہو، جس میں تمدن، معاشرت، سیاست اور تہذیبِ افکار و اعمال کے مسائل سے انھیں دوچار ہونا پڑے اور کسی ایجابی اسکیم کو مزاحمتوں اور مخالفتوں کے علی الرغم نافذ کرنے کی ضرورت ہو۔ اس لیے وہ صفاتِ محمودہ و غیر محمودہ کے اُس پورے شعبے کا نوٹس تک نہیں لیتے جو دنیا کے میدانِ کارزار میں ایک متعین مقصد لے کر اُترنے والے کے نقطۂ نظر سے مطلوب یا غیر مطلوب ہوا کرتی ہیں۔ انھیں عمارت کی مضبوطی سے بحث نہیں صرف اس کی زینت، اس کے تناسب اور اس کے رنگ و روغن اور نقش و نگار سے بحث ہے۔ ان کو سیرت کا زور اور اس کی صلابت مطلوب نہیں ہیں، محض اس کا حُسن مطلوب ہے۔ ان کو نفس کی وہ زبردست طاقتیں درکار نہیں جن سے وہ دنیا میں بھاری ذمہ داریوں کو سنبھالنے اور بڑے کام انجام دینے کے لیے تیار ہو بلکہ وہ لطیف قوتیں مطلوب ہیں جن سے وہ کشفِ صدور، کشفِ قبور، ادراکِ لطائفِ غیبی اور اسی نوع کی دوسری چیزوں پر قادر ہو جائے۔ اسی لیے وہ تدابیرِ تزکیہ میں سے صرف انھی چیزوں کو اختیار کرتے ہیں جو ان کی اس غرض کے لیے موزوں ہوتی ہیں۔ مسلمان آرٹسٹ ہوں یا غیر مسلم آرٹسٹ، سب کی غرض ان تدابیر سے فی الجملہ ایک ہی ہے، اور سب کے ہاں ان تدابیر کا مزاج یکساں ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ مسلمان آرٹسٹ ان تدابیر کا انتخاب اسلام کے مجموعۂ تدابیر میں سے کرتا ہے۔ ان کو پورے مجموعہ میں سے (جو کسی اور غرض کے لیے ایک اور ہی تناسب سے بنایا گیا تھا) الگ

نکال کر اپنے لیے مفید مطلب بناتا ہے، ان کے ساتھ اسی مزاج کی کچھ دوسری تدبیروں کا (کبھی بشرط اباحت اور کبھی بلا شرطِ اباحت) جوڑ لگاتا ہے، اور اس طرح وہ نفوسِ زکیہ تیار کرتا ہے جو اس کے آرٹ کے نقطۂ نظر کے مثالی نفوس ہوتے ہیں۔

اب پیشہ ور مزکّی کو لیجیے۔ اس کے ہاں آپ نصب العین کو بڑی حد تک مفقود پائیں گے۔ اس کے عمل میں آپ کو ہر ماڈل کے نفوسِ زکیہ مل جائیں گے۔ وہ کوشش کرے گا اُن صفاتِ قبیحہ کو دور کرنے کی جو تزکیہ کی منڈی میں غیر مطلوب ہیں اور پورا زور صرف کر دے گا اُن صفاتِ حسنہ کو نشو ونما دینے پر جن کی اس بازار میں مانگ پائی جاتی ہے۔ اسی غرض کے لیے وہ تزکیہ کی چند مناسب تدبیریں اختیار کرے گا، پھر ان تدبیروں سے جو نفوس زکیہ تیار ہوں گے ان کو چھوڑ دے گا کہ بازار میں جہاں کھپ سکیں کھپ جائیں۔ اس کا حال پیشہ ور اسلحہ ساز کا سا ہو گا جسے اس بات کی کچھ پروا نہیں ہوتی کہ اس کی صیقل کی ہوئی تلواریں کس کی کمر میں بندھتی ہیں۔ اس لیے کہ دنیا کے میدان کارزار میں اس کی نہ کسی سے جنگ ہے نہ دشمنی۔ وہ اس رزم گاہ میں ایک غیر جانبدار کاریگر ہے جس کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ اچھے اچھے پرہیزگار، فرض شناس، متدین، خوش معاملہ آدمی تیار کر دے۔ اب اگر یہ اس کے کارخانے کا مارکہ پیشانی پر لیے ہوئے کسی ظالم کی پولیس میں "متقی" تھانہ دار بن جائیں، یا کسی طاغوت کی عدالت میں غیر الٰہی بلکہ صریح خلافِ شریعتِ الٰہی قوانین کی بنیاد پر مقدمہ لڑانے والے "متدین" وکیل یا خود فیصلہ کرنے والے "پرہیزگار" طاغوت بن جائیں، یا اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے اُن میدانوں میں دھاوے ماریں جہاں علانیہ اللہ کے کھلے باغیوں کی کبریائی قائم ہوتی ہے، تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، بلکہ ایسے جتنے کامیاب پرزے اس کی خانقاہ سے منسوب ہوں گے اسی قدر زیادہ اس کی کامیابی کی شہادت فراہم ہو گی۔ اس کی تو اصل کامیابی یہی ہے کہ اس کے تیار کیے ہوئے پرزے خدا کی یاد اور اس کے خوف سے پائیداری حاصل کر کے خود خدا ہی کے باغیوں کی مشین میں نہایت خوبی کے ساتھ نصب ہو جائیں اور ان باغیوں کے اپنے دم سے

ہوئے پرزوں سے بھی کچھ زیادہ قابلِ اعتماد ثابت ہوں۔

اس کاروبار میں یہ پیشہ ور مربی نہ محض اخلاقی حسن وقبح کے معیار کو، اور نہ صرف تدابیر ترکیبہ کے نظام کو اپنے پیشہ کے مزاج پر ڈھالتا ہے بلکہ ایک الگ نظریہ زندگی اور ایک پورا فلسفۂ حیات وضع کر دیتا ہے جس کے بغیر اس کا یہ پیشہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساختہ و پرداختہ انسانوں کے دماغ اس تصور کی پیداوار کے لیے بالکل بنجر ہو جاتے ہیں کہ دنیا میں وہ اپنا بھی کوئی نظامِ زندگی رکھتے ہیں جسے دوسرے نظاموں کے بجائے قائم کرنے کے لیے انھیں مجاہدہ کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس وہ انھیں ہر نظام غالب میں بسہولت رہنے اور اس سے سازگاری کرنے اور اس کے اندر کھپ جانے کے لیے تیار کرتا ہے اور مذہب، اخلاق، روحانیت اور تہذیب کا ایک ایسا مناسب خلاصہ نکال کر انھیں دے دیتا ہے جسے ساتھ رکھ کر وہ ہر نظامِ فاسد کے جزوِ صالح بن سکتے ہیں۔

دنیوی مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں وہ بھی شامل ہیں جن کے پیشِ نظر اپنا یا اپنے خاندان یا طبقے کا کوئی مقصد ہوتا ہے، وہ بھی جو حبِ قوم یا حبِ وطن کی بنا پر ایک مقصد لے کر اٹھتے ہیں، اور وہ بھی جو مجرد انسانی مفاد کے لیے کوئی اسکیم چلانا چاہتے ہیں۔ پھر ان میں سے بعض کسی روحانی و اخلاقی مذہب کو مانتے ہیں اور بعض نہیں مانتے۔ جزئیات میں ان سب کے طریقِ انسان سازی میں کافی فرق ہوتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان سب کی مشترک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان کو اس حیثیت سے کم ہی دیکھتے ہیں کہ وہ انسان ہے، اس کے ساتھ زیادہ دلچسپی انھیں صرف اس حیثیت سے ہوتی ہے کہ وہ ان کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہی نقطۂ نظر ان کی انسان سازی کے پورے نظام پر حاوی ہوتا ہے، گویا وہ انسان نہیں بناتے بلکہ اپنی اسکیم کے آلات اور اپنی جنگ کے ہتھیار بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صفاتِ محمودہ و غیر محمودہ میں سے وہ صفات ان کی فہرست میں جگہ نہیں پاتیں جو انسانیت کے لحاظ سے محمود و غیر محمود ہیں ـــــ ایسی کچھ صفات سے وہ تعرض کرتے بھی ہیں تو انسانیت کے لحاظ سے نہیں بلکہ محض افادیت کے لحاظ سے ـــــ دراصل ان کی پوری فہرستِ اخلاق اس بنیاد پر مرتب ہوتی ہے کہ ان کی اسکیم کے نفاذ کا آلہ ہونے کی حیثیت سے انسان میں کونسی صفات ہونی چاہییں اور کونسی

نہ ہونی چاہییں۔ اسی بنیاد پر وہ اپنا نظامِ تزکیہ و تربیت تعمیر کرتے ہیں۔ اگر آپ ان کے اس نظامِ انسان سازی کے مزاج کو سمجھنا چاہیں تو صرف ایک بات اس کی مکمل تشخیص کے لیے کافی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جو صفات فی الواقع انسانیت عالیہ کی خصوصیات میں سے ہیں اُن کو بھی یہ نظام اس طور پر اپنے تربیت یافتہ انسانوں میں پرورش کرتا ہے کہ وہ شرفِ انسانیت کے بجائے محض ایک ہتھیار کی خوبی بن کر رہ جاتی ہیں۔ مثلاً صبر، کہ وہ بہترین انسانی صفات میں سے ہے، مگر یہ نظام جن انسانوں میں اتنا صبر پیدا کر دیتا ہے کہ وہ بموں کی بارش میں بھی ڈٹے رہتے ہیں ان کے اندر اتنا بھی صبر پیدا نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کے ایک معمولی سے تقاضے ہی کے مقابلہ میں ٹھیر جائیں۔

ان سب سے مختلف معاملہ اس شخص کا ہے جو انسان کو اس غرض کے لیے تیار کرنا چاہتا ہو کہ وہ خدا کے امتحان میں کامیاب ہو اور اس منصبِ خلافت کا، جو خدا نے انسان کے سپرد کیا ہے، پورا پورا حق ادا کر کے خدا کی رضا کو پہنچے۔ اس غرض کے لیے وہ اخلاق کے مسئلے کو اُس وسعت کے ساتھ اور پھر اُس جزرسی و باریک بینی کے ساتھ دیکھے گا جس کے ساتھ کوئی دوسرا اسے نہیں دیکھتا۔ وہ اس پورے دائرۂ زندگی کی پیمائش کرے گا جس میں انسان کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اس دائرے کے ہر ہر حصہ کے متعلق تحقیق کرے گا کہ کس حصہ میں کس پہلو سے آزمائش ہے اور اس آزمائش میں کامیابی کا مدار کس چیز پر ہے۔ پھر بحیثیت مجموعی پوری زندگی کے امتحان کے متعلق یہ تشخیص کرے گا کہ اس میں فی الواقع اللہ تعالیٰ کا وہ منشا کیا ہے جسے پورا کرنے پر ہی انسان کی کامیابی منحصر ہے۔ پھر اسی نقطۂ نظر سے یہ دیکھے گا کہ انسان کے اندر اور اس کے باہر کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جو اس کی کامیابی میں سدِّ راہ ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا سدِّ راہ ہونے کی حیثیت سے کیا مرتبہ ہے، اور اسی طرح باطن و خارج میں کیا چیزیں اس کی کامیابی کے لیے مفید و معاون ہیں اور اس افادت و معاونت کے اعتبار سے اُن کے کیا مدارج ہیں۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر وہ مطلوب اور غیر مطلوب امور کی فہرست مرتب کرے گا اور اسی بنیاد پر اس امر کا تعین بھی کرے گا کہ کونسی چیز کس درجہ میں مطلوب یا غیر مطلوب ہے اور اسے حاصل کرنے یا مٹانے پر کتنا زور صرف کرنا چاہیے۔ پھر یہی وہ بنیاد ہے جس پر وہ تزکیہ کی تدابیر کا انتخاب کرے گا۔ اس کے نظامِ تزکیہ میں ایسی تمام تدابیر جمع ہوں گی

جن سے انسان کی کامیابی کے باطنی موانع دور ہوں اور اس کے اندر خارجی موانع کو ہٹانے اور مٹانے کا عزم و حوصلہ نشوونما پاسکے، نیز جن سے وہ چیزیں جو کہ باطن میں ابھریں اور ترقی کریں جو اس کی کامیابی میں مددگار ہوسکتی ہیں اور ان چیزوں اور ان چیزوں کو وہ حاصل کرنے اور ترقی دینے کا مشتاق و اہل بن جائے جو خارج میں اس کے لیے موجب فوز و فلاح ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ وہ ایسی تمام تدبیروں کو اپنے نظام میں جمع کرے گا، بلکہ درحقیقت اس کے نظام میں ان تمام تدبیروں کے اندر اسی مقصد کی روح کارفرما ہوگی اور اسی مقصد کو ملحوظ رکھ کر وہ ان تدبیروں کو ایک تناسب کے ساتھ اپنے نظام تزکیہ میں جگہ دے گا۔

یہی آخری قسم کا تزکیہ نفس اسلامی تزکیہ نفس ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نظام تزکیہ کے مصطلحات اور اس کے بعض اجزاء کسی دوسری نوعیت کے نظامِ تزکیہ میں بھی پائے جائیں، لیکن سخت غلطی پر ہوگا وہ شخص جو محض اتنی مماثلت دیکھ کر اسے اسلامی تزکیہ نفس سمجھ بیٹھے گا۔ خوب سمجھ لیجیے کہ جہاں مطلوب اور غیر مطلوب اشیاء کی فہرست میں اسلام کی فہرست سے کچھ کمی و بیشی پائی جاتی ہے، جہاں ان کے مراتب مطلوبیت و غیر مطلوبیت میں بھی کچھ الٹ پھیر ہے، جہاں تزکیہ نفس کے کام میں آرٹ یا پیشہ وری یا دنیا طلبی کا رنگ پایا جاتا ہے، اور جہاں تدابیر تزکیہ اور اُن کے اُس تناسب میں، جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کیا تھا، تصرف بھی کیا گیا ہے، وہاں ضرور مقصدِ تزکیہ بدل گیا ہے اور مقصد کے بدل جانے کی وجہ سے نوعیتِ تزکیہ بھی بدل چکی ہے۔ ایسا تزکیہ نفس، خواہ اس میں تقویٰ و طہارت کی کتنی ہی گفتگو ہو، اور خواہ اس میں اسلامی تزکیہ نفس کے مقدس ترین اجزاء کتنے ہی مبالغے کے ساتھ شامل کیے گئے ہوں، بہرحال اُس قدر کا مستحق نہیں ہو سکتا جو صرف اسلامی تزکیہ نفس ہی کے لیے مختص ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی مقصد کے لیے لڑنے والے نے اگر تلوار پر صیقل کا ایک ہاتھ مارنے کو بڑے اجر و ثواب کا کام قرار دیا ہو، تو یہ اجر و ثواب کا حکم وہاں ہرگز چسپاں نہ ہوگا جہاں محض آرٹ کے طور پر صیقل کے ہاتھ مارے جا رہے ہوں یا جہاں اس کے دشمن کے لیے تلواریں صیقل کی جا رہی ہوں۔

تفہیم القرآن

(۱۵)

الانعام

(از وسط رکوع ۱۶ تا ختم سورہ)

ان لوگوں نے اللہ کے لیے خود اسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے[1] اور کہتے ہیں یہ اللہ کے لیے ہے، بزعم خود، اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے۔[2] پھر جو حصہ ان کے ٹھیرائے ہوئے

---

[1] اوپر کا سلسلۂ تقریر اس بات پر تمام ہوا تھا کہ اگر یہ لوگ نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اپنی جاہلیت پر اصرار ہی کیے جاتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ اچھا، تم اپنے طریقہ پر عمل کرتے رہو اور میں اپنے طریقہ پر عمل کروں گا، قیامت ایک دن ضرور آنی ہے، اس وقت تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس روش کا کیا انجام ہوتا ہے، بہر حال یہ خوب سمجھ لو کہ وہاں ظالموں کو فلاح نصیب نہ ہوگی۔ اس کے بعد اب اس جاہلیت کی کچھ تشریح کی جاتی ہے جس پر یہ لوگ اصرار کر رہے تھے اور جسے چھوڑنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے۔ انھیں بتایا جا رہا ہے کہ تمہارا وہ "ظلم" کیا ہے جس پر قائم رہتے ہوئے تم کسی فلاح کی امید نہیں کر سکتے۔

[2] اس بات کے وہ خود قائل تھے کہ زمین اللہ کی ہے اور کھیتیاں وہی اگاتا ہے، نیز اُن جانوروں کا خالق بھی اللہ ہی ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خدمت لیتے ہیں۔ لیکن ان کا تصور یہ تھا کہ ان پر اللہ کا یہ فضل ان فرشتوں اور جنات، اور آسمانی حاملین اور بزرگان سلف کی ارواح کے طفیل و برکت سے ہے جو ان پر نظر کرم رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو حصے نکالتے تھے۔ ایک حصہ اللہ کے نام کا، اس شکریہ میں کہ اس نے یہ کھیت اور یہ جانور انھیں بخشے۔ اور دوسرا حصہ اپنے قبیلہ یا خاندان کے سرپرست معبودوں کی نذر و نیاز کا تاکہ ان کی مہربانیاں ان کے شامل حال رہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے ان کے اسی ظلم پر گرفت فرماتا ہے کہ یہ سب مویشی ہمارے پیدا کیے ہوئے اور ہمارے عطا کردہ ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے[۱] -

(بقیہ سابق) ان میں یہ دوسروں کی نذر و نیاز کیسی ؟ یہ نمک حرامی نہیں تو کیا ہے کہ تم اپنے محسن کے احسان کو جو اس نے خود اپنی مہربانی سے تم پر کیا ہے، دوسروں کے توسط کا نتیجہ قرار دیتے ہو اور شکریہ کے استحقاق میں انھیں اُس کے ساتھ شریک کرتے ہو۔ پھر اشارۃً دوسری گرفت اس بات پر بھی فرمائی ہے کہ یہ اللہ کا حصہ جو انھوں نے مقرر کیا ہے یہ بھی بزعم خود کر لیا ہے، اپنے شارع خود بن بیٹھے ہیں، آپ ہی جو حصہ چاہتے ہیں اللہ کے لیے مقرر کر لیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں دوسروں کے لیے طے کر دیتے ہیں، حالانکہ اپنی بخشش کا اصل مالک و مختار خود اللہ ہے اور یہ بات اسی کی شریعت کے مطابق طے ہونی چاہیے کہ اس بخشش میں سے کتنا حصہ اس کے شکریہ کے لیے نکالا جائے اور باقی میں کون کون حقدار ہیں۔ پس درحقیقت اس خود مختارانہ طریقہ سے جو حصہ یہ لوگ اپنے زعم باطل میں خدا کے لیے نکالتے ہیں اور فقراء و مساکین وغیرہ پر خیرات کرتے ہیں وہ بھی کوئی نیکی نہیں ہے اور خدا کے ہاں اس کے مقبول ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۱] یہ لطیف طنز ہے ان کی اس حرکت پر کہ وہ خدا کے نام سے جو حصہ نکالتے تھے اس میں بھی طرح طرح کی چالبازیاں کر کے کمی کرتے رہتے تھے اور ہر صورت سے اپنے خود ساختہ شریکوں کا حصہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جو دلچسپی انھیں ان شریکوں سے ہے وہ خدا سے نہیں ہے۔ مثلاً جو غلہ یا پھل وغیرہ خدا کے نام پر نکالے جاتے ان میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شریکوں کے حصہ میں شامل کر دیا جاتا تھا، اور اگر شریکوں کے حصہ میں سے گرتا، یا خدا کے حصہ میں مل جاتا تو اُسے انہی کے حصہ میں واپس کیا جاتا۔ کھیت کا جو حصہ شریکوں کی نذر کے لیے مخصوص کیا جاتا تھا اگر اس میں سے پانی اُس حصہ کی طرف پھوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تھا تو اس کی ساری پیداوار شریکوں کے حصہ میں داخل کر دی جاتی تھی، لیکن اگر اس کے برعکس صورت پیش آتی تو خدا کے حصہ میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا غلہ خود استعمال کر لینے کی ضرورت پیش آجاتی تو خدا کا حصہ کھا لیتے تھے مگر شریکوں کے حصہ کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شریکوں کے حصہ میں کچھ کمی آجاتی تو وہ خدا کے حصہ سے پوری کی جاتی تھی لیکن خدا کے حصہ میں کمی ہوتی تو شریکوں کے حصہ میں سے ایک حبہ بھی اس میں نہ ڈالا جاتا۔ اس طرزِ عمل پر کوئی نکتہ چینی کرتا تو جواب میں طرح طرح کی دل فریب توجیہیں کی جاتی تھیں، مثلاً کہتے تھے کہ خدا تو غنی ہے، اس کے حصہ میں سے کچھ کم بھی ہو جائے تو اُسے کیا پروا ہو سکتی ہے، رہے یہ شریک، تو یہ بندے ہیں، خدا کی طرح غنی نہیں ہیں، اس لیے ذرا سی کمی بیشی پر بھی ان کے ہاں (باقی اگلے صفحہ پر)

کیسے بُرے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ !

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے[1]

(بقیہ سابق) گرفت ہو جاتی ہے۔

ان توہمات کی اصل جڑ کیا تھی، اس کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ جہلائے عرب اپنے مال میں سے جو حصہ خدا کے لیے نکالتے تھے، وہ فقیروں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مد میں صرف کیا جاتا تھا، اور جو حصہ شریکوں کی نذر و نیاز کے لیے نکالتے تھے وہ یا تو براہِ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر چڑھاوے کی صورت میں پیش کیا جاتا اور اس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پوجاریوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی لیے ان خود غرض مذہبی پیشواؤں نے صدیوں کی مسلسل تلقین سے ان جاہلوں کے دل میں یہ بات بٹھائی تھی کہ خدا کے حصہ میں کمی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، مگر "خدا کے پیاروں" کے حصہ میں کمی نہ ہونی چاہیے بلکہ حتی الامکان کچھ بیشی ہی ہوتی رہے تو بہتر ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] یہاں "شریکوں" کا لفظ ایک دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اوپر کے معنی سے مختلف ہے۔ اوپر کی آیت میں جنھیں "شریک" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا تھا وہ ان کے وہ معبود تھے جن کی برکت یا سفارش یا توسط کو یہ لوگ نعمت کے حصول میں دخیل سمجھتے تھے اور شکرِ نعمت کے استحقاق میں انھیں خدا کے ساتھ حصہ دار بناتے تھے۔ بخلاف اس کے اس آیت میں "شریک" سے مراد وہ انسان اور شیطان ہیں جنھوں نے قتلِ اولاد کو ان لوگوں کی نگاہ میں ایک جائز اور پسندیدہ فعل بنا دیا۔ انھیں شریک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے جس طرح پرستش کا مستحق تنہا اللہ تعالیٰ ہے، اسی طرح بندوں کے لیے قانون بنانے اور جائز و ناجائز کی حدیں مقرر کرنے کا حق دار بھی صرف اللہ ہے۔ لہٰذا جس طرح کسی دوسرے کے آگے پرستش کے افعال میں سے کوئی فعل کرنا اسے خدا کا شریک بنانے کا ہم معنی ہے، اسی طرح کسی کے خود ساختہ قانون کو برحق سمجھتے ہوئے اس کی پابندی کرنا اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کو واجب الاطاعت ماننا بھی اسے خدائی میں اللہ کا شریک قرار دینے کا ہم معنی ہے۔ یہ دونوں افعال بہرحال شرک ہیں، خواہ ان کا مرتکب اُن ہستیوں کو زبان سے الٰہ اور رب کہے یا نہ کہے جن کے آگے وہ نذر و نیاز پیش کرتا ہے یا جن کے مقرر کیے ہوئے قانون کو وہ واجب الاطاعت مانتا ہے۔

قتلِ اولاد کی تین صورتیں اہلِ عرب میں رائج تھیں اور قرآن میں تینوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں[۱] اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں[۲]۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے، لہٰذا انھیں چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں[۳]۔

(بقیہ سابق) (۱) لڑکیوں کا قتل اس خیال سے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے یا قبائلی لڑائیوں میں وہ دشمن کے ہاتھ نہ پڑیں، یا کسی دوسرے سبب سے وہ ان کے لیے سبب عار نہ بنیں۔ (۲) بچوں کا قتل اس خیال سے کہ ان کی پرورش کا بار نہ اٹھایا جا سکے گا اور ذرائع معاش کی کمی کے سبب سے وہ ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائیں گے۔ (۳) بچوں کو اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لیے بھینٹ چڑھانا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یہ ہلاکت کا لفظ نہایت معنی خیز ہے۔ اس سے مراد اخلاقی ہلاکت بھی ہے کہ جو انسان سنگدلی اور شقاوت کی اس حد کو پہنچ جائے کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے لگے اس میں جوہرِ انسانیت تو درکنار جوہرِ حیوانیت تک باقی نہیں رہتا۔ اور قومی و قومی ہلاکت بھی کہ قتلِ اولاد کا لازمی نتیجہ نسلوں کا گھٹنا اور آبادی کا کم ہونا ہے جس سے نوعِ انسانی کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور وہ قوم بھی تباہی کے گڑھے میں گرتی ہے جو اپنے حامیوں اور اپنے تمدن کے کارکنوں اور اپنی میراث کے وارثوں کو پیدا نہیں ہونے دیتی یا پیدا ہوتے ہی خود اپنے ہاتھوں ختم کر ڈالتی ہے۔ اور اس سے مراد انجامی ہلاکت بھی ہے کہ جو شخص معصوم بچوں پر یہ ظلم کرتا ہے، اور جو اپنی انسانیت کو بلکہ اپنی حیوانی فطرت تک کو یوں الٹی چھری سے ذبح کرتا ہے، اور جو نوعِ انسانی کے ساتھ اور خود اپنی قوم کے ساتھ یہ دشمنی کرتا ہے وہ اپنے آپ کو خدا کے شدید عذاب کا مستحق بناتا ہے۔

[۲] زمانۂ جاہلیت کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیم و اسماعیل کا پیرو کہتے اور سمجھتے تھے اور اس بنا پر ان کا خیال یہ تھا کہ جس مذہب کا وہ اتباع کر رہے ہیں وہ خدا کا پسندیدہ مذہب ہی ہے۔ لیکن جو دین ان لوگوں نے حضرت ابراہیم و اسماعیل سے سیکھا تھا اس کے اندر بعد کی صدیوں میں مذہبی پیشوا، قبائل کے سردار، خاندانوں کے بڑے بوڑھے اور مختلف لوگ طرح طرح کے عقائد اور اعمال اور رسوم کا اضافہ کرتے چلے گئے جنھیں آنے والی نسلوں نے اصل مذہب کا جزء سمجھا اور عقیدت مندی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ چونکہ روایات میں یا تاریخ میں، یا کسی کتاب میں ایسا کوئی ریکارڈ محفوظ نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ اصل مذہب کیا تھا اور بعد میں کیا چیزیں کس زمانہ میں کس نے کس طرح بڑھائیں، اس وجہ سے اہلِ عرب کے لیے ان کا پورا دین مشتبہ ہو کر رہ گیا تھا، نہ کسی چیز کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ اُس اصل دین کا جزء ہے جو خدا کی طرف سے آیا تھا اور نہ یہ جانتے تھے کہ یہ بدعات اور غلط رسوم ہیں جو بعد میں لوگوں نے بڑھا دیں۔ اسی صورتِ حال کی (باقی اگلے صفحہ پر)

کہتے ہیں یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں، انھیں صرف وہی لوگ کھا سکتے ہیں جنھیں ہم کھلانا چاہیں، اور یہ پابندی ان کی خودساختہ ہے۔[۱] پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر اللہ کا نام نہیں لیتے[۲]، اور یہ سب کچھ انھوں نے اللہ پر افترا کیا ہے[۳]، عنقریب اللہ انھیں ان افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا۔

(بقیہ سابق) ترجمانی اس فقرے میں کی گئی ہے۔

۳۵ یعنی اگر اللہ چاہتا کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کر سکتے۔ لیکن چونکہ اس کی مشیت یہی تھی کہ جو شخص جس راہ پر جانا چاہتا ہے اسے جانے کا موقع دیا جائے اسی لیے یہ سب کچھ ہوا۔ پس اگر یہ لوگ تمھارے سمجھانے سے نہیں مانتے اور ان افترا پردازیوں ہی پر انھیں اصرار ہے تو جو کچھ یہ کرنا چاہتے ہیں کرنے دو۔ ان کے پیچھے پڑنے کی کچھ ضرورت نہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) سلہ اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ بعض جانوروں کے متعلق یا بعض کھیتیوں کی پیداوار کے متعلق منت مان لیتے تھے کہ یہ فلاں آستانے یا فلاں حضرت کی نیاز کے لیے مخصوص ہیں۔ اس نیاز کو ہر ایک نہ کھا سکتا تھا۔ بلکہ اس کے لیے ان کے ہاں ایک مفصل ضابطہ تھا جس کی رو سے مختلف نیازوں کو مختلف قسم کے مخصوص لوگ ہی کھا سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس فعل کو نہ صرف مشرکانہ افعال میں شمار کرتا ہے بلکہ اس پہلو پر بھی تنبیہ فرماتا ہے کہ یہ ضابطہ ان کا خودساختہ ہے۔ یعنی جس خدا کے رزق میں سے وہ یہ منتیں مانتے اور نیازیں کرتے ہیں اس نے نہ ان منتوں اور نیازوں کا حکم دیا ہے اور نہ ان کے کھانے کے متعلق یہ پابندیاں عائد کی ہیں۔ یہ سب کچھ ان خودسر اور باغی بندوں نے اپنے اختیار سے خود ہی تصنیف کر لیا ہے۔

سلہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب کے ہاں بعض مخصوص منتوں اور نذروں کے جانور ایسے ہوتے تھے جن پر خدا کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا، کیونکہ حج کے لیے لبیک اللھم لبیک کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دودھ دوہتے وقت، یا ان پر سوار ہونے کی حالت میں، یا ان کو ذبح کرتے ہوئے، یا ان کو کھانے کے وقت اہتمام کیا جاتا تھا کہ خدا کا نام زبان پر نہ آئے۔

سلہ یعنی یہ قاعدے خدا کے مقرر کیے ہوئے نہیں ہیں، مگر وہ ان کی پابندی یہی سمجھتے ہوئے کر رہے ہیں کہ انھیں خدا نے مقرر کیا ہے، اور ایسا سمجھنے کے لیے ان کے پاس خدا کے کسی حکم کی سند نہیں ہے بلکہ صرف یہ سند ہے کہ باپ دادا سے یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔

...رکہتے ہیں کہ جو کچھ ان جانوروں کے پیٹ میں ہے یہ ہمارے مردوں کے لیے مخصوص ہے اور ہماری عورتوں پر حرام، لیکن اگر وہ مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں[۱۱۱]۔ یہ باتیں جو انھوں نے گھڑلی ہیں ان کا بدلہ اللہ انھیں دے کر رہے گا۔ یقیناً وہ حکیم ہے اور سب باتوں کی اسے خبر ہے۔

یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا اور اللہ کے دیے ہوئے رزق کو اللہ پر افترا پردازی کرکے حرام ٹھیرا لیا۔ یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ راہِ راست پانے والوں میں سے نہ تھے[۱۱۲]۔ ع

وہ اللہ ہی ہے جس نے طرح طرح کے باغ اور تاکستان[۱۱۳] اور نخلستان پیدا کیے، کھیتیاں اگائیں جن سے قسم قسم

---

[۱۱۱] اہلِ عرب کے ہاں نذروں اور منتوں کے جانوروں کے متعلق جو خود ساختہ شریعت بنی ہوئی تھی اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو بچہ پیدا ہو اس کا گوشت صرف مرد کھا سکتے ہیں، عورتوں کے لیے ان کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن اگر وہ بچہ مردہ ہو یا مر جائے تو اس کا گوشت کھانے میں مرد و عورت سب شریک ہو سکتے ہیں۔

[۱۱۲] یعنی اگرچہ وہ تمھارے باپ دادا تھے، تمھارے مذہبی بزرگ تھے، تمھارے پیشوا اور سردار تھے، لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہے، ان کے ایجاد کیے ہوئے غلط طریقے صرف اس لیے صحیح اور مقدس نہیں ہو سکتے کہ وہ تمھارے اسلاف اور بزرگ تھے۔ جن ظالموں نے قتلِ اولاد جیسے وحشیانہ فعل کو رسم بنایا ہو، جنھوں نے خدا کے دیے ہوئے رزق کو خواہ مخواہ خدا کے بندوں پر حرام کیا ہو، جنھوں نے دین میں اپنی طرف سے نئی نئی باتیں شامل کرکے خدا کی طرف منسوب کی ہوں، وہ آخر فلاح یاب اور راست رَو کیسے ہو سکتے ہیں۔ چاہے وہ تمھارے اسلاف اور بزرگ ہی کیوں نہ ہوں، بہرحال تھے وہ گمراہ اور اپنی اس گمراہی کا برا انجام بھی وہ دیکھ کر رہیں گے۔

[۱۱۳] اصل میں جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے مراد دو طرح کے باغ ہیں، ایک وہ جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں، دوسرے وہ جن کے درخت خود اپنے تنوں پر کھڑے رہتے ہیں۔ ہماری زبان میں باغ کا لفظ صرف دوسری قسم کے باغوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے ہم نے جَنّٰتٍ غَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ کا ترجمہ "باغ" کیا ہے اور جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ کے لیے "تاکستان" (یعنی انگوری باغ) کا لفظ اختیار کیا ہے۔

کے ماکولات حاصل ہوتے ہیں، زیتون اور انار کے درخت پیدا کیے جن کے پھل صورت میں مشابہ اور مزے میں مختلف ہوتے ہیں۔ کھاؤ ان کی پیداوار جب کہ یہ پھلیں، اور اللہ کا حق ادا کرو جب ان کی فصل کاٹو، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ پھر وہی ہے جس نے مویشیوں میں سے وہ جانور بھی پیدا کیے جن سے سواری و بار برداری کا کام لیا جاتا ہے اور وہ بھی جو کھانے اور بچھانے کے کام آتے ہیں۔[1] کھاؤ اُن چیزوں میں سے جو اللہ نے تمھیں بخشی ہیں اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔[2] یہ آٹھ نر و مادہ ہیں، دو بھیڑ کی قسم سے اور دو بکری کی قسم سے، اے محمدؐ ان سے پوچھو کہ اللہ نے اُن کے نر حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچے جو بھیڑوں اور بکریوں کے پیٹ میں ہوں؟ ٹھیک ٹھیک علم کے ساتھ مجھے بتاؤ اگر تم سچے ہو۔[3] اور اسی طرح دو اونٹ کی قسم سے ہیں اور دو گائے کی قسم سے۔ پوچھو، ان کے نر اللہ نے حرام کیے ہیں یا مادہ، یا وہ بچے جو اونٹنی اور گائے کے پیٹ

---

[1] اصل میں لفظ فَرْش استعمال ہوا ہے۔ جانور کو فرش کہنا یا تو اس رعایت سے ہے کہ وہ چھوٹے قد کے ہیں اور زمین سے لگے ہوئے چلتے ہیں۔ یا اس رعایت سے کہ وہ ذبح کے لیے زمین پر لٹائے جاتے ہیں، یا اس رعایت سے کہ ان کی کھالوں اور ان کے بالوں سے فرش بنائے جاتے ہیں۔

[2] سلسلۂ کلام پر نظر کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ تین باتیں ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔ ایک یہ کہ یہ باغ اور کھیت اور یہ جانور جو تم کو حاصل ہیں، یہ سب اللہ کے بخشے ہوئے ہیں، کسی دوسرے کا اس بخشش میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس لیے بخشش کے شکریہ میں بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ جب یہ چیزیں اللہ کی بخشش ہیں تو ان کے استعمال میں اللہ ہی کے قانون کی پیروی ہونی چاہیے، کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کے استعمال پر اپنی طرف سے حدود مقرر کر دے۔ اللہ کے سوا کسی اور کی مقرر کردہ رسموں کی پابندی کرنا اور اللہ کے سوا کسی اور کے آگے شکر نعمت کی نذر پیش کرنا ہی حد سے گزرنا ہے اور یہی شیطان کی پیروی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہ سب چیزیں اللہ نے انسان کے کھانے پینے اور استعمال کرنے ہی کے لیے پیدا کی ہیں، اس لیے پیدا نہیں کیں کہ انھیں خواہ مخواہ حرام کر لیا جائے۔ اپنے اوہام اور قیاسات کی بنا پر جو پابندیاں لوگوں نے خدا کے رزق اور اس کی بخشی ہوئی چیزوں کے استعمال پر عائد کر لی ہیں وہ سب منشاء الٰہی کے خلاف ہیں۔

[3] یعنی گمان و وہم و آبائی روایات نہ پیش کرو بلکہ علم پیش کرو اگر وہ تمھارے پاس ہو۔

میں ہوں؟[۱] کیا تم اُس وقت حاضر تھے جب اللہ نے ان کے حرام ہونے کا حکم تمھیں دیا تھا؟ پھر اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی طرف منسوب کرکے جھوٹی بات کہے تاکہ علم کے بغیر لوگوں کی غلط رہنمائی کرے۔ یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو راہ راست نہیں دکھاتا۔ ع

اے محمدؐ! ان سے کہو کہ جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں تو مَیں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو الّا یہ کہ وہ مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا سور کا گوشت ہو کہ وہ ناپاک ہے، یا فسق ہو کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔[۲] پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں (کوئی چیز ان میں سے کھالے) بغیر اس کے

---

[۱] یہ سوال اس تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ ان پر خود اپنے ان توہمات کی غیر معقولیت واضح ہو جائے۔ یہ بات کہ ایک ہی جانور کا نر حلال ہو اور مادہ حرام، یا مادہ حلال ہو اور نر حرام، یا جانور خود حلال ہو مگر اس کا بچہ حرام، یہ صریحاً ایک نامعقول بات ہے کہ عقل سلیم اسے ماننے سے انکار کرتی ہے اور کوئی ذی عقل انسان یہ تصور نہیں کر سکتا کہ خدا نے ایسی لغویات کا حکم دیا ہوگا۔ پھر جس طریقہ سے قرآن نے اہلِ عرب کو ان کے ان توہمات کی غیر معقولیت سمجھانے کی کوشش کی ہے بعینہٖ اسی طریقہ پر دنیا کی ان دوسری قوموں کو بھی اُن کے توہمات کی لغویت پر متنبہ کیا جا سکتا ہے جن کے اندر کھانے پینے کی چیزوں میں حرمت وحلت کی غیر معقول پابندیاں اور چھوت چھات کی قیود پائی جاتی ہیں۔

[۲] یہ مضمون سورۂ بقرہ رکوع ۲۱ اور سورۂ مائدہ رکوع ۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ اور آگے سورۂ نحل رکوع ۱۵ میں بھی آنے والا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت اور اس آیت میں بظاہر اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ وہاں محض "خون" کہا گیا ہے اور یہاں خون کے ساتھ مَسْفُوْحًا کی قید لگائی گئی ہے، یعنی ایسا خون جو کسی جانور کو زخمی کرکے یا ذبح کرکے نکالا گیا ہو۔ مگر دراصل یہ اختلاف نہیں بلکہ اس حکم کی تشریح ہے۔ اسی طرح سورۂ مائدہ کی آیت میں ان چار چیزوں کے علاوہ چند اور چیزوں کی حرمت کا بھی ذکر ملتا ہے یعنی وہ جانور جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ لیکن فی الحقیقت یہ بھی اختلاف نہیں ہے بلکہ ایک تشریح ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو جانور اس طور پر ہلاک ہوئے ہوں وہ بھی مردار کی تعریف میں آتے ہیں۔ فقہائے اسلام میں سے ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ حیوانی غذاؤں میں سے یہی چار چیزیں حرام ہیں اور ان کے سوا

(باقی اگلے صفحہ پر)

کہ وہ نافرمانی کا ارادہ رکھتا ہو اور بغیر اس کے کہ وہ حد ضرورت سے تجاوز کرے ، تو یقیناً تمہارا رب درگزر سے کام لینے والا اور رحم فرمانے والا ہے ۔ اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے

(بقیہ سابق) ہر چیز کا کھانا جائز ہے ۔ یہی مسلک حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عائشہ کا تھا ۔ لیکن متعدد احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض چیزوں کے کھانے سے یا تو منع فرمایا ہے یا ان پر کراہت کا اظہار فرمایا ہے ، مثلاً پالتو گدھے کچلیوں والے درندے اور پنجوں والے پرندے ۔ اس وجہ سے اکثر فقہاء تحریم کو ان چار چیزوں تک محدود نہیں مانتے بلکہ دوسری چیزوں تک اسے وسیع قرار دیتے ہیں ۔ مگر اس کے بعد پھر مختلف چیزوں کی حلت و حرمت میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے ۔ مثلاً پالتو گدھے کو امام ابوحنیفہ ، امام مالک ، اور امام شافعی حرام قرار دیتے ہیں ۔ لیکن بعض دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ وہ حرام نہیں ہے بلکہ کسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اس کی ممانعت فرما دی تھی ۔ درندہ جانوروں اور پرندوں کو حنفیہ مطلقاً حرام قرار دیتے ہیں مگر امام مالک اور اوزاعی کے نزدیک شکاری پرندے حلال ہیں ، لیث کے نزدیک بلی حلال ہے ، امام شافعی کے نزدیک صرف وہ درندے حرام ہیں جو انسان پر حملہ کرتے ہیں جیسے شیر ، بھیڑیا ، چیتا وغیرہ ، عکرمہ کے نزدیک کوا اور بجو دونوں حلال ہیں ۔ اسی طرح حنفیہ تمام حشرات الارض کو حرام قرار دیتے ہیں ، مگر ابن ابی لیلیٰ ، امام مالک اور اوزاعی کے نزدیک سانپ حلال ہے ۔

ان تمام مختلف اقوال اور ان کے دلائل پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ دراصل شریعت الٰہی میں قطعی حرمت اُن چار ہی چیزوں کی ہے جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے ۔ ان کے سوا دوسری حیوانی غذاؤں میں مختلف درجوں کی کراہت ہے ۔ جن چیزوں کی کراہت صحیح روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ حرمت کے درجہ سے قریب تر ہیں اور جن چیزوں میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہوا ہے ان کی کراہت مشکوک ہے ۔ رہی طبعی کراہت جس کی بنا پر بعض اشخاص بعض چیزوں کو کھانا پسند نہیں کرتے ، یا طبقاتی کراہت جس کی بنا پر انسانوں کے بعض طبقے بعض چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں ، یا قومی کراہت جس کی بنا پر بعض قومیں بعض چیزوں سے نفرت کرتی ہیں ، تو شریعتِ الٰہی کسی کو مجبور نہیں کرتی کہ وہ خواہ مخواہ ہر اس چیز کو ضرور ہی کھائے جو حرام نہیں کی گئی ہے اور اسی طرح شریعت کسی کو یہ حق بھی نہیں دیتی کہ وہ اپنی کراہت کو قانون قرار دے اور ان لوگوں پر الزام عائد کرے جو ایسی غذائیں استعمال کرتے ہیں جنھیں وہ ناپسند کرتا ہے ۔

جانور حرام کر دیے تھے، اور گائے اور بکری کی چربی بھی بجز اس کے جو اُن کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے لگی رہ جائے[۱۲۴]۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا انھیں دی تھی اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ اب اگر وہ تمھیں جھٹلائیں تو ان سے کہہ دو کہ تمھارے رب کا دامنِ رحمت وسیع ہے اور مجرموں سے اس کے عذاب کو پھیرا نہیں جا سکتا[۱۲۵]۔

یہ مشرک لوگ (تمھاری ان باتوں کے جواب میں) ضرور کہیں گے کہ "اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھیراتے[۱۲۶]"۔ ایسی ہی باتیں بنا بنا کر ان سے پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا یہاں تک کہ آخر کار ہمارے عذاب کا مزا انھوں نے چکھ لیا۔ ان سے کہو "کیا تمھارے پاس کوئی علم ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو؟ تم تو محض گمان کے پیچھے چل رہے ہو اور نری قیاس آرائیاں کرتے ہو"۔ پھر کہو (تمھاری اس حجت کے مقابلہ میں) "حقیقت رس حجت تو اللہ کے پاس ہے، بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت

---

[۱۲۴] ترتیب کلام پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت ماسبق میں جن چار چیزوں کی حرمت بیان کی گئی ہے وہ تمام زمانوں میں تمام انبیاء کی امتوں کے لیے حرام رہی ہیں اور ان کی حرمت قانونِ خداوندی کے ایسے محکمات میں سے ہے جن کے اندر کبھی کسی زمانہ میں فرق نہیں آیا ہے۔ البتہ یہودیوں کے لیے خاص طور پر اُن چار چیزوں کے علاوہ یہ چند چیزیں بھی حرام کی گئی تھیں اور یہ حرمت دراصل ان کے لیے ایک سزا تھی جس کے دوسروں تک متعدی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ حرمت کا کوئی مستقل سبب بجائے خود ان اشیاء میں نہ تھا کہ تمام انسانوں کے لیے اصلاً انھیں حرام کیا جاتا۔

[۱۲۵] یعنی اگر تم اب بھی اپنی نافرمانی کی روش سے باز آ جاؤ اور بندگی کے صحیح رویہ کی طرف پلٹ آؤ تو اپنے رب کے دامنِ رحمت کو اپنے لیے کشادہ پاؤ گے لیکن اگر اپنی اسی مجرمانہ و باغیانہ روش پر رہو گے تو خوب جان لو کہ اُس کے غضب سے بھی پھر کوئی بچانے والا نہیں ہے۔

[۱۲۶] یعنی وہ اپنے جرم اور اپنی غلط کاری کے لیے وہی پرانا عذر پیش کریں گے جو ہمیشہ سے مجرم اور غلط کار لوگ پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہمارے حق میں اللہ کی مشیت یہی ہے کہ ہم شرک کریں اور جن چیزوں کو ہم نے حرام ٹھیرا رکھا ہے انھیں حرام ٹھیرائیں۔ ورنہ اگر خدا نہ چاہتا کہ ہم ایسا کریں تو کیونکر ممکن تھا کہ یہ افعال ہم سے صادر ہوتے۔ پس چونکہ ہم اللہ کی مشیت کے مطابق یہ سب کچھ کر رہے ہیں اس لیے درست کر رہے ہیں، اگر کوئی الزام اگر ہے تو ہم پر نہیں، اللہ پر ہے۔ اور جو کچھ ہم کر رہے ہیں ایسا ہی کرنے پر مجبور ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔

دے دیتا"۔؎

؎ یہ ان کے عذر کا مکمل جواب ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے اس کا تجزیہ کر کے دیکھنا چاہیے:

پہلی بات یہ فرمائی کہ اپنی غلط کاری و گمراہی کے لیے مشیتِ الٰہی کو معذرت کے طور پر پیش کرنا اور اسے بہانا بنا کر صحیح رہنمائی کو قبول کرنے سے انکار کرنا مجرموں کا قدیم شیوہ رہا ہے اور اس کا انجام یہ ہوا ہے کہ آخر کار وہ تباہ ہوئے اور حق کے خلاف چلنے کا برا نتیجہ انھوں نے دیکھ لیا۔

پھر فرمایا کہ یہ عذر جو تم پیش کر رہے ہو یہ دراصل علم حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض گمان اور تخمینہ ہے۔ یعنی تم نے محض مشیت کا لفظ کہیں سے سن لیا ہے اور اس پر قیاسات کی عمارت کھڑی کر رہے ہو۔ تمھیں خبر نہیں ہے کہ انسان کے حق میں فی الواقع اللہ کی مشیت کیا ہے اور انسان کس طرح رضائے الٰہی کے خلاف اور اس کے موافق دونوں طرح کے کام مشیتِ الٰہی کے تحت خود اپنے ہی اختیار سے کرتا ہے۔ اس حقیقت کو جانے اور سمجھے بغیر تم نے مشیت کے معنی یہ قرار دے لیے ہیں کہ جو شخص جو فعل بھی کر رہا ہے اس لیے کر رہا ہے کہ اللہ نے یہ چاہا کہ وہ ایسا کرے لہٰذا نہ صحیح صحیح ہے نہ غلط غلط بلکہ سب کچھ اللہ کے افعال ہیں جن کی کوئی ذمہ داری اُن لوگوں پر نہیں ہے جو ان افعال کے ظہور و صدور کا ذریعہ بنتے ہیں۔

آخر میں ایک ہی فقرے کے اندر کانٹے کی بات بھی فرما دی کہ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ یعنی اپنی غلط روی کے حق میں جو حجت تم پیش کر رہے ہو وہ حقیقت سے بہت دور ہٹی ہوئی حجت ہے، ٹھیک ٹھیک حقیقت تک پہنچی ہوئی حجت تو اللہ کے پاس ہے اور وہ یہ ہے کہ "اللہ چاہتا تو تم سب کو راہِ راست پر لگا دیتا"۔ اس مختصر جملہ میں دو باتیں صاف ہو گئیں۔ ایک یہ کہ تمھارے شرک اور تمھاری باغیانہ شریعت سازی کا مشیتِ الٰہی کے تحت ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ یہی راہِ راست بھی ہے۔ اگرچہ راست روی اور کج روی دونوں اسی وقت ممکن ہوتی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ انسان کے ارادۂ راست روی یا ارادۂ کج روی کو فعل میں آنے کا اذن دینا چاہے اور اس لحاظ سے تمھاری بات یہاں تک صحیح ہے کہ اگر اللہ تمھاری کج روی کو وجود میں آنے کی اجازت نہ دینا چاہتا تو وہ ہرگز وجود میں نہ آسکتی تھی لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ جب اللہ نے اس کج روی کو وجود میں آنے کی اجازت دے دی تو یہ کج روی نہیں رہی۔ بغاشید سے استدلال کرنا چاہتے ہو تو شوق سے کرو، لیکن حقیقت نفس الامری صحیح طور پر ان الفاظ میں بیان ہو سکے گی کہ اگر خدا چاہتا

(باقی اگلے صفحہ پر)

ان سے کہو کہ "لاؤ اپنے وہ گواہ جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ ہی نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے"۔
پھر اگر وہ شہادت دے دیں تو تم ان کے ساتھ شہادت نہ دینا[۱] اور ہرگز اُن لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا
جنھوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور جو آخرت کے منکر ہیں اور دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر بناتے ہیں۔ ع

اے محمد! ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سناؤں تمھارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں[۲]:

(بقیہ سابق) تو تم شرک نہ کرتے"، بلکہ اسے واضح طور پر بیان کرنے کے لیے یوں کہنا چاہیے کہ "اگر خدا چاہتا تو تمھیں سیدھے راستے پر لگا دیتا"۔ دوسرے یہ کہ اپنی اختیار کی ہوئی کج روی کے لیے اگر تم مشیت کو عذر کے طور پر پیش کرتے ہو اور جو راہ راست تمھارے سامنے پیش کی جا رہی ہے اسے قبول نہ کرنے کے لیے مشیت کو بہانا بناتے ہو، تو در اصل تم یہ کہتے ہو کہ ہم خود اپنی رضی سے تو راست رو بننے کے لیے تیار نہیں ہیں، البتہ اگر خدا کو ہماری راست روی کی ضرورت ہے تو ہم سے اختیار کی قوت، یعنی انسانیت کا جوہر اصلی سلب کر کے ہم کو حیوانات اور نباتات کی طرح ایسا راست رو بنا دے کہ ہم اس کے مقرر کیے ہوئے راستے سے ہٹ کر کسی دوسری طرف جا ہی نہ سکیں۔ تو بیشک اللہ یہ قدرت رکھتا تھا کہ تم سب کو ہاتھ پکڑ کر سیدھے راستے پر ڈال دیتا مگر انسان کے لیے اس کی مشیت یہ ہے ہی نہیں کہ اسے اس طرح راست رو بنائے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۱] یعنی اگر وہ شہادت کی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ شہادت اُسی بات کی دینی چاہیے جس کا آدمی کو علم ہو، تو وہ کبھی یہ شہادت دینے کی جرأت نہ کریں گے کہ کھانے پینے پر یہ قیود جو ان کے ہاں رسم کے طور پر رائج ہیں، اور یہ پابندیاں کہ فلاں چیز کو فلاں نہ کھائے اور فلاں چیز کو فلاں کا ہاتھ نہ لگے، یہ سب خدا کی مقرر کردہ ہیں۔ لیکن اگر یہ لوگ شہادت کی ذمہ داری کو محسوس کیے بغیر اتنی ڈھٹائی پر اتر آئیں کہ خدا کا نام لے کر جھوٹی شہادت دینے میں بھی تامل نہ کریں تو ان کے اس جھوٹ میں تم ان کے ساتھی نہ بنو۔ کیونکہ اُن سے یہ شہادت اس لیے طلب نہیں کی جا رہی ہے کہ اگر یہ شہادت دے دیں تو تم ان کی بات مان لوگے، بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ ان میں سے جن لوگوں کے اندر کچھ بھی راست بازی موجود ہے ان سے جب کہا جائے گا کہ کیا واقعی تم سچائی کے ساتھ اس بات کی شہادت دے سکتے ہو کہ یہ ضوابط خدا ہی کے مقرر کیے ہوئے ہیں تو وہ اپنی رسموں کی حقیقت پر غور کریں گے اور جب ان کے من جانب اللہ ہونے کا کوئی ثبوت نہ پائیں گے تو ان فضول رسموں کی پابندی سے باز آجائیں گے۔

[۲] یعنی تمھارے رب کی عائد کی ہوئی پابندیاں وہ نہیں ہیں جن میں تم گرفتار ہو، بلکہ اصل پابندیاں یہ ہیں جو اللہ نے انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے عائد کی ہیں اور جو ہمیشہ سے شرائع الٰہیہ کی اصل الاصول رہی ہیں۔

یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو،[1]

---

[1] یعنی نہ خدا کی ذات میں کسی کو اس کا شریک ٹھیراؤ، نہ اس کی صفات میں، نہ اس کے اختیارات میں اور نہ اس کے حقوق میں۔

ذات میں شرک یہ ہے کہ جوہرِ الوہیت میں کسی کو حصہ دار قرار دیا جائے۔ مثلاً نصاریٰ کا عقیدۂ تثلیث، مشرکین عرب کا فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دینا، اور دوسرے مشرکین کا اپنے دیوتاؤں اور دیویوں کو اور اپنے شاہی خاندانوں کو جنسِ الٰہ کے افراد قرار دینا، یہ سب شرک فی الذات ہیں۔

صفات میں شرک یہ ہے کہ خدائی صفات جیسی کہ وہ خدا کے لیے ہیں، ویسا ہی اُن کو یا اُن میں سے کسی صفت کو کسی دوسرے کے لیے قرار دینا۔ مثلاً کسی کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس پر غیب کی ساری حقیقتیں روشن ہیں، یا وہ سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہے، یا وہ تمام نقائص اور تمام کمزوریوں سے منزہ اور بالکل بے خطا ہے۔

اختیارات میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے جو اختیارات صرف اللہ کے لیے خاص ہیں اُن کو یا ان میں سے کسی کو اللہ کے سوا کسی اور کے لیے تسلیم کیا جائے۔ مثلاً فوق الفطری طریقے سے نفع و ضرر پہنچانا، حاجت روائی و دستگیری کرنا، محافظت و نگہبانی کرنا، دعائیں سننا اور قسمتوں کو بنانا اور بگاڑنا، نیز حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنا اور انسانی زندگی کے لیے قانون و شرع تجویز کرنا۔ یہ سب خداوندی کے مخصوص اختیارات ہیں جن میں سے کسی کو غیر اللہ کے لیے تسلیم کرنا شرک ہے۔

حقوق میں شرک یہ ہے کہ خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر خدا کے جو مخصوص حقوق ہیں وہ یا ان میں سے کوئی حق خدا کے سوا کسی اور کے لیے مانا جائے۔ مثلاً رکوع و سجود، دست بستہ قیام، سلامی و آستانہ بوسی، شکرِ نعمت یا اعترافِ برتری کے لیے نذر و نیاز اور قربانی، قضائے حاجات اور رفعِ مشکلات کے لیے منّت، مصائب و مشکلات میں مدد کے لیے پکارا جانا، اور ایسی ہی پرستش و تعظیم و تمجید کی دوسری تمام صورتیں اللہ کے مخصوص حقوق میں سے ہیں۔ اسی طرح ایسا محبوب ہونا کہ اس کی محبت پر دوسری سب محبتیں قربان کی جائیں، اور ایسا مستحقِ تقویٰ و خشیت ہونا کہ غیب و شہادت میں اس کی ناراضی اور اس کے حکم کی خلاف ورزی سے ڈرا جائے، یہ بھی صرف اللہ کا حق ہے۔ اور یہ بھی اللہ ہی کا حق ہے کہ اس کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اور اس کی ہدایت کو صحیح و غلط کا معیار مانا جائے، اور کسی ایسی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں نہ ڈالا جائے جو اللہ کی اطاعت سے آزاد ایک مستقل اطاعت ہو اور جس کے حکم کے لیے اللہ کے حکم کی سند نہ ہو۔ ان حقوق میں سے جو حق بھی دوسرے کو دیا جائے گا وہ اللہ کا شریک ٹھیرے گا خواہ اس کو خدائی ناموں میں سے کوئی نام دیا جائے یا نہ دیا جائے۔

۲ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو[۱۲۸]،

۳ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اُن کو بھی دیں گے،

۴ اور بے شرمی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ[۱۲۹] خواہ دکھلی ہوں یا چھپی،

۵ اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ[۱۳۰]۔

---

۱۲۸ نیک سلوک میں ادب، تعظیم، اطاعت، رضا جوئی، خدمت، سب داخل ہیں۔ والدین کے اس حق کو قرآن میں ہر جگہ توحید کے حکم کے بعد بیان فرمایا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کے بعد بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم حق انسان پر اس کے والدین کا ہے۔

۱۲۹ اصل میں لفظ "فواحش" استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق ان تمام افعال پر ہوتا ہے جن کی برائی بالکل واضح ہے۔ قرآن میں زنا، عمل قوم لوط، برہنگی، جھوٹی تہمت، اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے کو فحش افعال میں شمار کیا گیا ہے۔ حدیث میں چوری اور شراب نوشی اور بھیک مانگنے کو من جملہ فواحش کہا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے تمام شرمناک افعال بھی فواحش میں داخل ہیں اور ارشاد الٰہی یہ ہے کہ اس قسم کے افعال نہ علانیہ کیے جائیں نہ چھپ کر۔

۱۳۰ یعنی انسانی جان، جو فی الاصل خدا کی طرف سے حرام ٹھیرائی گئی ہے، ہلاک نہ کی جائے مگر حق کے ساتھ۔ اب رہا یہ سوال کہ "حق کے ساتھ" کا کیا مفہوم ہے، تو اس کی تین صورتیں قرآن میں بیان کی گئی ہیں اور دو صورتیں اس پر زائد، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔ قرآن کی بیان کردہ صورتیں یہ ہیں کہ:

(۱) انسان کسی دوسرے انسان کے قتل کا مجرم ہو اور اس پر قصاص کا حق قائم ہو گیا ہو،

(۲) دین حق کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو اور اس سے جنگ کیے بغیر چارہ نہ رہا ہو،

(۳) دارالاسلام کے حدود میں بدامنی پھیلائے یا اسلامی نظام حکومت کو الٹنے کی سعی کرے،

باقی دو صورتیں جو حدیث میں ارشاد ہوئی ہیں، یہ ہیں:

(۴) شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے،

(۵) ارتداد اور خروج از جماعت کا مرتکب ہو۔

ان پانچ صورتوں کے سوا کسی صورت میں انسان کا قتل انسان کے لیے حلال نہیں ہے، خواہ وہ مومن ہو یا ذمی یا عام کافر۔

یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو[1] یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے۔

اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو، ہم ہر شخص پر ذمہ داری کا اتنا ہی بار رکھتے ہیں جتنا اس کے امکان میں ہے[2]۔

اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔

اور اللہ کے عہد کو پورا کرو[3]۔

---

[1] یعنی ایسا طریقہ جو زیادہ سے زیادہ بے غرضی، نیک نیتی اور یتیم کی خیر خواہی پر مبنی ہو اور جس پر خدا اور خلق کسی کی طرف سے بھی تم اعتراض کے مستحق نہ ہو۔

[2] یہ اگرچہ شریعت الٰہی کا ایک مستقل اصول ہے لیکن یہاں اس کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص اپنی حد تک ناپ تول اور لین دین کے معاملات میں راستی و انصاف سے کام لینے کی کوشش کرے وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے گا، بھول چوک یا نادانستہ کمی و بیشی ہو جانے پر اس سے باز پرس نہ ہوگی۔

[3] اللہ کے عہد سے مراد وہ عہد بھی ہے جو انسان اپنے خدا سے کرے، اور وہ بھی جو خدا کا نام لے کر بندوں سے کرے، اور وہ بھی جو انسان اور خدا، اور انسان اور انسان کے درمیان اُسی وقت آپ سے آپ بندھ جاتا ہے جس وقت ایک شخص خدا کی زمین میں ایک انسانی سوسائٹی کے اندر پیدا ہوتا ہے۔

پہلے دونوں عہد شعوری و ارادی ہیں اور یہ تیسرا عہد ایک فطری عہد (Natural Contract) ہے جس کے باندھنے میں اگرچہ انسان کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے، لیکن واجب الاحترام ہونے میں یہ پہلے دونوں عہدوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ کسی شخص کا خدا کے بخشے ہوئے وجود سے، اس کی عطا کی ہوئی جسمانی و نفسانی قوتوں سے، اس کے دیے ہوئے جسمانی آلات سے، اور اس کی پیدا کی ہوئی زمین اور رزق اور ذرائع سے فائدہ اٹھانا، اور اُن مواقع زندگی سے متمتع ہونا جو قوانینِ قدرت کی بدولت فراہم ہوتے ہیں، خود بخود فطرۃً خدا کے کچھ حقوق اس پر عائد کر دیتا ہے۔ اور اسی طرح آدمی کا ایک ماں کے پیٹ میں اس کے خون سے پرورش پانا، (باقی اگلے صفحے پر)

ان باتوں کی ہدایت اللہ نے تمہیں کی ہے شاید کہ تم نصیحت قبول کرو۔

نیز اس کی ہدایت یہ ہے کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹا کر تمہیں پراگندہ کر دیں گے[1]۔ یہ ہے وہ ہدایت جو تمہارے ربّ نے تمہیں کی ہے، شاید کہ تم کج روی سے بچو۔

(بقیہ سابق) ایک باپ کی محنتوں سے بسے بسائے گھر میں پیدا ہونا، اور ایک اجتماعی زندگی کے بے شمار مختلف اداروں سے مختلف صورتوں میں متمتع ہونا، علی قدر مراتب اس کے ذمہ اجتماع کے بہت سے افراد اور اداروں کے حقوق بھی عائد کر دیتا ہے۔ انسان کا خدا سے، اور انسان کا سوسائٹی سے یہ عہد کسی کاغذ پر نہیں لکھا گیا مگر اس کے رونگٹے رونگٹے پر ثبت ہے، اور انسان نے اسے شعور و ارادہ کے ساتھ نہیں باندھا مگر اس کا پورا وجود اسی عہد کا رہینِ منت ہے۔ اسی عہد کی طرف سورۂ بقرہ رکوع ۳ میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فاسق وہ ہیں جو اللہ کے عہد کو اس کی استواری کے بعد توڑتے ہیں اور جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُسے کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں"۔ اور اسی کا ذکر آگے چل کر سورۂ اعراف رکوع ۲۲ میں آتا ہے کہ اللہ نے ازل میں بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو نکال کر ان سے شہادت طلب کی تھی کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ اور انھوں نے اقرار کیا تھا کہ ہاں، ہم گواہ ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] اوپر جس فطری عہد کا ذکر ہوا ہے، یہ اس عہد کا لازمی اقتضا ہے کہ انسان اپنے رب کے بتائے ہوئے راستہ پر چلے، کیونکہ اس کے امر کی پیروی سے منہ موڑنا اور خودسری و خود مختاری یا بندگیٔ غیر کی جانب قدم بڑھانا انسان کی طرف سے اس عہد کی اوّلین خلاف ورزی ہے جس کے بعد ہر قدم پر اس کی دفعات ٹوٹتی چلی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اس نہایت نازک، نہایت وسیع اور نہایت پیچیدہ عہد کی ذمہ داریوں سے انسان ہرگز عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جب تک وہ خدا کی رہنمائی کو قبول کر کے اس کے بتائے ہوئے راستہ پر زندگی بسر نہ کرے۔ اس کو قبول نہ کرنے کے دو زبردست نقصان ہیں۔ ایک یہ کہ ہر دوسرے راستہ کی پیروی لازماً انسان کو اس راہ سے ہٹا دیتی ہے جو خدا کے قرب اور اس کی رضا تک پہنچنے کی ایک ہی راہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس راستہ سے ہٹتے ہی بے شمار پگڈنڈیاں سامنے آجاتی ہیں جن میں بھٹک کر پوری نوعِ انسانی پراگندہ ہو جاتی ہے اور اس پراگندگی کے ساتھ ہی اس کے بلوغ و ارتقاء کا خواب بھی پریشان ہو کر رہ جاتا ہے۔ انہی دونوں نقصانات کو اس فقرے میں بیان کیا گیا ہے کہ "دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اس کے راستہ سے ہٹا کر پراگندہ کر دیں گے"۔

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی تھی جو بھلائی کی روش اختیار کرنے والے انسان پر نعمت کی تکمیل،
اور ہر ضروری چیز کی تفصیل اور سراسر ہدایت و رحمت تھی (اور اس لیے بنی اسرائیل کو دی گئی تھی کہ) شاید
ع ۱۹ لوگ اپنے رب کی ملاقات پر ایمان لائیں[1] اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے، ایک مبارک کتاب،
پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو بعید نہیں کہ تم پر رحم کیا جائے۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب
تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں[2] کو دی گئی تھی اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اور اب تم یہ بہانا
بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راست رو ثابت ہوتے۔ تمہارے پاس تمہارے
رب کی طرف سے ایک دلیل روشن اور ہدایت اور رحمت آگئی ہے، اب اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات
کو جھٹلائے اور ان سے منہ موڑے۔[3] جو لوگ ہماری آیات سے منہ موڑتے ہیں انہیں اس روگردانی کی پاداش میں

---

[1] رب کی ملاقات پر ایمان لانے سے مراد اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھنا اور ذمہ دارانہ زندگی بسر کرنا ہے۔ یہاں اس ارشاد کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ خود بنی اسرائیل میں اس کتاب کی حکیمانہ تعلیمات سے ذمہ داری کا احساس بیدار ہو جائے۔ دوسرے یہ کہ عام لوگ اس اعلیٰ درجہ کے نظام زندگی کا مطالعہ کر کے اور نیکوکار انسانوں میں اس نعمت ہدایت اور اس رحمت کے اثرات دیکھ کر یہ محسوس کر لیں کہ انکار آخرت کی غیر ذمہ دارانہ زندگی کے مقابلہ میں وہ زندگی ہر اعتبار سے بہتر ہے جو اقرار آخرت کی بنیاد پر ذمہ دارانہ طریقہ سے بسر کی جاتی ہے، اور اس طرح یہ مشاہدہ و مطالعہ انہیں انکار سے ایمان کی طرف کھینچ لائے۔

[2] یعنی یہود و نصاریٰ۔

[3] اللہ کی آیات سے مراد اس کے وہ ارشادات بھی ہیں جو قرآن کی صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کیے جا رہے تھے، اور وہ نشانیاں بھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور آپ پر ایمان لانے والوں کی پاکیزہ زندگی میں نمایاں نظر آتی تھیں، اور وہ آثار کائنات بھی جنہیں قرآن اپنی دعوت کی تائید میں شہادت کے طور پر پیش کر رہا تھا۔

ہم بدترین سزا دے کر رہیں گے۔ کیا اب لوگ اس کے منتظر ہیں کہ ان کے سامنے فرشتے آکھڑے ہوں یا تمہارا رب خود آجائے یا تمہارے رب کی بعض صریح نشانیاں نمودار ہو جائیں[۱]؟ جس روز تمہارے رب کی بعض مخصوص نشانیاں نمودار ہو جائیں گی پھر کسی ایسے شخص کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو[۲]۔ اے محمدؐ! ان سے کہدو کہ اچھا، تم انتظار کرو، ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے یقیناً ان سے تمہارا کچھ واسطہ نہیں[۳]،

---

[۱] یعنی آثارِ قیامت، یا عذاب، یا کوئی اور ایسی نشانی جو حقیقت کی بالکل پردہ کشائی کر دینے والی ہو اور جس کے ظاہر ہو جانے کے بعد امتحان و آزمائش کا کوئی سوال باقی نہ رہے۔

[۲] یعنی ایسی نشانیوں کے ظہور کے بعد جو کافر اپنے کفر سے توبہ کر کے ایمان لا ئے اس کا ایمان لانا بے معنی ہے، اور اسی طرح جو نافرمان مومن اپنی نافرمانی کی روش چھوڑ کر اطاعت کیش بنے اس کی اطاعت بھی بے معنی ہے۔ ایمان اور اطاعت ہر چیز کی قدر اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردے میں ہے، مہلت کی رسّی دراز نظر آ رہی ہے، اور دنیا اپنی ساری متاعِ غرور کے ساتھ یہ دھوکا دینے کے لیے موجود ہے کہ کیسا خدا اور کہاں کی آخرت، بس کھاؤ پیو اور مزے کرو۔

[۳] خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اور آپ کے واسطہ سے دین حق کے تمام پیرو اس کے مخاطب ہیں۔ ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ اصل دین ہمیشہ سے یہی رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ ایک خدا کو اِلٰہ اور رب مانا جائے، اللہ کی ذات، صفات، اختیارات اور حقوق میں کسی کو شریک نہ کیا جائے، اللہ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتے ہوئے آخرت پر ایمان لایا جائے، اور ان وسیع اصول و کلیات کے مطابق زندگی بسر کی جائے جن کی تعلیم اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے دی ہے۔ یہی دین تمام انسانوں کو اول یوم پیدائش سے دیا گیا تھا۔ بعد میں جتنے مختلف مذاہب بنے وہ سب کے سب اس طرح بنے کہ مختلف زمانوں کے لوگوں نے اپنے ذہن کی غلط اپچ سے یا خواہشات نفس کے غلبہ سے یا عقیدت کے غلو سے اس دین کو بدلا اور اس میں نئی نئی باتیں ملائیں۔ اس کے عقائد میں اپنے اوہام و قیاسات اور فلسفوں سے کمی و بیشی اور ترمیم و تحریف کی۔ اس کے احکام میں بدعات کے اضافے کیے۔ خود ساختہ قوانین بڑھائے، جزئیات میں موشگافیاں کیں، فروعی اختلافات میں مبالغہ کیا، اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنایا۔ اس کے لانے والے انبیاء اور اس کے علمبردار بزرگوں میں سے کسی کی عقیدت میں غلو کیا اور کسی کو بغض و مخالفت کا نشانہ بنایا۔ اس طرح بے شمار مذاہب بنتے چلے گئے اور ہر مذہب کی پیدائش

(باقی اگلے صفحہ پر)

ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے، وہی ان کو بتائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ جو اللہ کے حضور نیکی لے کر آئے گا اس کے لیے دس گنا اجر ہے، اور جو بدی لے کر آئے گا اس کو اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا جتنا اس نے قصور کیا ہے اور کسی پر ظلم نہ کیا جائے گا۔

اے محمدؐ! کہو۔ میرے رب نے بالیقین مجھے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، بالکل ٹھیک دین جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں، ابراہیم کا طریقہ[۱۴۱] جسے یکسو ہو کر اس نے اختیار کیا تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ کہو، میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت[۱۴۲]، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔ کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے؟[۱۴۳] ہر شخص جو کچھ کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے، کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا،[۱۴۴]

(بقیہ سابق) نوع انسانی کو متخاصم گروہوں میں تقسیم کرتی چلی گئی۔ اب جو شخص بھی اصل دینِ حق کا پیرو ہو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ان ساری گروہ بندیوں سے الگ ہو جائے اور ان سب سے اپنا راستہ جدا کر لے۔

(بقیہ سابق) [۱۴۱] "ابراہیم کا طریقہ" یہ اس راستے کی نشان دہی کے لیے مزید ایک تعریف ہے۔ اگرچہ اس کو موسیٰ کا طریقہ یا عیسیٰ کا طریقہ بھی کہا جا سکتا تھا، مگر حضرت موسیٰ کی طرف دنیا نے یہودیت کو اور حضرت عیسیٰ کی طرف مسیحیت کو منسوب کر رکھا ہے، اس لیے "ابراہیم کا طریقہ" فرمایا، کیونکہ یہودی اور عیسائی دونوں حضرت ابراہیم کو راست رو تسلیم کرتے ہیں، اور دونوں یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم اس یہودیت اور عیسائیت کی پیدائش سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔ نیز مشرکین عرب بھی حضرت ابراہیم کو راست رو مانتے تھے اور اپنی جہالت کے باوجود کم از کم اتنی بات انھیں بھی تسلیم تھی کہ کعبہ کی بنا رکھنے والا پاکیزہ انسان خالص خدا پرست تھا نہ کہ بت پرست۔

[۱۴۲] اصل میں لفظ "نُسُک" استعمال ہوا ہے جس کا اطلاق بندگی و پرستش کی تمام صورتوں پر ہوتا ہے۔

[۱۴۳] یعنی کائنات کی ساری چیزوں کا رب تو اللہ ہے، میرا رب کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے۔ کس طرح یہ بات معقول ہو سکتی ہے کہ ساری کائنات تو اللہ کی اطاعت کے نظام پر چل رہی ہو اور کائنات کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے میرا اپنا وجود بھی اسی نظام پر عمل پیرا ہو مگر میں اپنی شعوری و اختیاری زندگی کے لیے کوئی اور رب تلاش کروں اور پوری کائنات کے خلاف ایک دوسرے رُخ پر چل پڑوں۔

[۱۴۴] یعنی ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار خود ہے، ایک کے عمل کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں ہے۔

پھر تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے، اُس وقت وہ تمھارے اختلافات کی حقیقت تم پر کھول دے گا۔ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں زیادہ بلند درجے دیے۔ تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمھاری آزمائش کرے[۱]۔ بے شک تمھارا رب سزا دینے میں بھی تیز ہے اور بہت درگزر کرنے اور رحم فرمانے والا بھی ہے۔ ع۲۰

[۱] اس فقرہ میں تین حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ تمام انسان زمین میں خدا کے خلیفہ ہیں، اس معنی میں کہ خدا نے اپنی مملوکات میں سے بہت سی چیزیں ان کی امانت میں دی ہیں اور ان پر تصرف کے اختیارات بخشے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان خلیفوں میں مراتب کا فرق بھی خدا ہی نے رکھا ہے، کسی کی امانت کا دائرہ وسیع ہے اور کسی کا محدود، کسی کو زیادہ چیزوں پر تصرف کے اختیارات دیے ہیں اور کسی کو کم چیزوں پر، کسی کو زیادہ قوتِ کارکردگی دی ہے اور کسی کو کم، اور بعض انسان بھی بعض انسانوں کی امانت میں ہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ سب کچھ دراصل امتحان کا سامان ہے، پوری زندگی ایک امتحان گاہ ہے اور جس کو جو کچھ بھی خدا نے دیا ہے اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس نے کس طرح خدا کی امانت میں تصرف کیا، کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا، اور کس حد تک اپنی قابلیت یا ناقابلیت کا ثبوت دیا۔ اسی امتحان کے نتیجہ پر زندگی کے دوسرے مرحلہ میں انسان کے درجے کا تعین منحصر ہے۔

مقالات

قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے

[میرا یہ مضمون آج سے ۱۶ سال پہلے اخبار "الجمعیت" کے حبیب نمبر میں شائع ہوا تھا اور پھر پرانے فائلوں میں مدفون پڑا ہوا تھا۔ بعض رفقاء نے توجہ دلائی کہ اب پھر اس کی اشاعت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اب یہ ان صفحات میں درج کیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر]

دنیا میں انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہمیشہ ایسے پاک نفوس پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اپنی زبان اور اپنے عمل سے اس کو حق و صداقت کا سیدھا راستہ دکھایا ہے لیکن انسان اکثر ان کے اس احسان کا بدلہ ظلم ہی کی شکل میں دیتا رہا ہے۔ ظلم صرف اس معنی میں نہیں کہ ان کے پیغام سے اعراض کیا، ان کی صداقت سے انکار کیا، ان کی دعوت کو رد کر دیا اور ان کو تکلیفیں دے کر راہ حق سے پھیرنے کی کوشش کی، بلکہ اس معنی میں بھی کہ ان کے بعد ان کی تعلیمات کو مسخ کیا، ان کی ہدایتوں کو بدل ڈالا، ان کی کتابوں میں تحریف کی اور خود ان کی شخصیتوں کو اپنی اوہام پرستی کا کھلونا بنا کر الوہیت اور خدائی کا رنگ دے دیا۔ پہلی قسم کا ظلم تو ان نفوسِ قدسیہ کی زندگی تک یا حد سے حد اس کے چند سال بعد تک ہی محدود رہا، مگر یہ دوسری قسم کا ظلم ان کے بعد صدیوں تک ہوتا رہا اور بہت سوں کے ساتھ آج بھی ہو رہا ہے۔ دنیا میں آج تک جتنے داعیانِ حق مبعوث ہوئے ہیں سب نے اپنی زندگی اُن جھوٹے خداؤں کی خدائی ختم کرنے میں صرف کی جنھیں انسان نے خدائے واحد کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا لیا تھا لیکن ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ ان کے بعد ان کے پیروؤں نے جاہلانہ عقیدت کی بنا پر خود انہی کو خدا یا خدائی میں خدا کا شریک بنا لیا۔ اور وہ بھی ان بتوں میں شامل کر لیے گئے جنھیں توڑنے میں انھوں نے اپنی تمام عمر کی محنتیں صرف کر دی تھیں۔

دراصل انسان اپنے آپ سے کچھ ایسا بدگمان ہے کہ اسے خود اپنی انسانیت میں صفات قدسیہ و ملکوتیہ کے وجود کا بہت کم یقین آتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو محض کمزوریوں اور پستیوں ہی کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ اس کا ذہن اس حقیقت کبریٰ کے علم و اذعان سے عموماً خالی رہتا ہے کہ اس کالبد خاکی میں حق جل مجدہ نے وہ قوتیں بھی ودیعت کی ہیں جو اس کو بشر ہونے اور بشری صفات سے متصف رہنے کے باوجود عالم پاک میں ملائکہ مقربین سے بھی بلند درجہ تک پہنچا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی اس کے ہم جنسوں میں سے کسی نے اپنے آپ کو خدا کے نمائندے کی حیثیت سے اس کے سامنے پیش کیا تو اس نے یہ دیکھ کر کہ یہ تو میری ہی طرح گوشت پوست کا انسان ہے، اسے خدا رسیدہ ماننے سے صاف انکار کر دیا، اور جب بالآخر اس کی ذات میں غیر معمولی محاسن کا جلوہ دیکھ کر سر عقیدت جھکایا تو پھر کہا کہ جو ہستی ایسی فوق العادۃ خوبیوں کی مالک ہو وہ ہرگز بشر نہیں ہو سکتی۔ پھر کسی گروہ نے اس کو خدا بنایا، کسی نے حلول کا عقیدہ ایجاد کر کے یقین کر لیا کہ خدا نے اس کی شکل میں ظہور کیا ہے، کسی نے اس کے اندر خدائی صفات اور خداوندانہ اختیارات کا گمان کیا، اور کسی نے حکم لگا دیا کہ وہ خدا کا بیٹا ہے۔ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

دنیا کے کسی پیشوائے دین کی زندگی کو لے لو، تم دیکھو گے کہ اس کی ذات پر سب سے زیادہ ظلم خود اس کے معتقدین ہی نے کیا ہے۔ انھوں نے اس پر اپنے تخیلات و اوہام کے اتنے پردے ڈال دیے ہیں کہ اس کی شکل و صورت دیکھنا بالکل محال ہو گیا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ ان کی محرف کتابوں سے یہ معلوم کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ اس کی اصلی تعلیم کیا تھی، بلکہ ہم ان سے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ وہ خود اصل میں کیا تھا۔ اس کی پیدائش میں اعجوبگی، اس کی طفولیت میں اعجوبگی، اس کی جوانی اور بڑھاپے میں اعجوبگی، اس کی زندگی کی ہر ہر بات میں اعجوبگی اور اس کی موت تک میں اعجوبگی۔ غرض ابتدا سے لے کر انتہا تک وہ ایک افسانہ ہی افسانہ نظر آتا ہے اور اس کو اس شکل میں پیش کیا جاتا ہے کہ یا تو وہ خود خدا تھا، یا خدا کا بیٹا تھا، یا خدا اس میں حلول کر گیا تھا یا کم از کم وہ خدائی میں کسی حد تک شریک و سہیم تھا۔

مثال کے طور پر گوتم بدھ کو دیکھو۔ بودھ مذہب کے نہایت گہرے مطالعہ سے صرف اتنا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس اولوالعزم انسان نے برہمنیت کے بہت سے نقائص کی اصلاح کی تھی اور خصوصیت کے ساتھ ان بیشمار

ہستیوں کی خدائی کا بطلان کیا تھا جن کو اس عہد کے لوگوں نے اپنا معبود بنا لیا تھا۔ مگر اس کے انتقال کو پوری ایک صدی بھی نہ گذری تھی کہ ویسالی کی کونسل میں اُس کے پیروؤں نے اس کی تمام تعلیمات کو بدل ڈالا، اصل سوتروں کے بجائے نئے سوتر بنا لیے اور اصول و فروع میں اپنے اہوا و افکار کے مطابق جس طرح چاہا تصرف کر ڈالا۔ ایک طرف بودھ کے نام سے اپنے مذہب کے ایسے عقائد مقرر کیے جن میں خدا کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا اور دوسری طرف بودھ کو عقل کل، مدار کائنات اور ایک ایسی ہستی قرار دے دیا جو ہر عہد میں دنیا کی اصلاح کے لیے بودھ بن کر آیا کرتی ہے۔ اس کی پیدائش، زندگی اور گذشتہ و آئندہ جنموں کے متعلق ایسے ایسے عجیب افسانے بنا لیے جن کو پڑھ کر پروفیسر ولسن جیسے محققین حیران ہو کر یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ تاریخ میں فی الواقع بودھ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ تین چار صدی کے اندر ان افسانوں نے بودھ میں الوہیت کا رنگ پیدا کر دیا اور کنشک کے زمانہ میں بودھ مت کے اعیان وائمہ کی ایک بہت بڑی کونسل نے (جو کشمیر میں منعقد ہوئی تھی) فیصلہ کر دیا کہ بودھ دراصل خدا کا مادی ظہور تھا یا بالفاظ دیگر خدا اس کے جسم میں حلول کر گیا تھا۔

یہی سلوک رام چندر جی کے ساتھ ہوا۔ رامائن کے مطالعہ سے صاف مترشح ہوتا ہے کہ راجہ رام چندر جی محض ایک انسان تھے۔ نیک دلی، انصاف، شجاعت، فیاضی، تواضع، حلم، اور ایثار میں کمال کا مرتبہ تو انھیں ضرور حاصل تھا، مگر الوہیت کا شائبہ تک ان میں نہ تھا۔ لیکن بشریت اور ان اعلیٰ صفات کا اجتماع ایک ایسا معمہ ثابت ہوا کہ اہل ہند کی عقل اس کو حل نہ کر سکی۔ چنانچہ رام چندر جی کی وفات پر ایک زمانہ گذرنے کے بعد یہ عقیدہ تسلیم کر لیا گیا کہ ان کے اندر وشنو نے حلول کیا تھا اور وہ اُن ہستیوں میں سے ایک تھے جن کی شکل میں وشنو جی سنسار کی اصلاح کے لیے بار بار بذاتِ مختلفہ ظہور کرتے رہے ہیں۔

سری کرشن اس معاملہ میں ان دونوں سے زیادہ مظلوم ہیں۔ بھگوت گیتا تحریف و تنسیخ کے کئی عملوں سے نکل کر جس شکل میں ہم تک پہنچی ہے اس کے عمیق مطالعہ سے کم از کم اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کرشن جی ایک موحد تھے اور انھوں نے ہستی باری تعالیٰ کے ہمہ گیر قادر مطلق اور شدید القویٰ ہونے کا وعظ کہا تھا۔ لیکن مہابھارت، وشنو پران،

بھاگوت پران وغیرہ کتابیں اور خود گیتا ان کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ ایک طرف وہ وشنو[1] کے جسمانی مظہر، خالق موجود[2] اور مدبر کائنات نظر آتے ہیں اور دوسری طرف ایسی کمزوریاں ان کی طرف منسوب ہیں کہ انھیں خدا تو خدا، پاکیزہ اخلاق کا انسان بھی تسلیم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ گیتا میں کرشن جی کے یہ اقوال ہمیں ملتے ہیں:

"اس دنیا کا ماں باپ، مہارا اور بابا میں ہی ہوں۔ جو کچھ پاکیزہ، یا جو کچھ جاننے کے قابل ہے وہ سب اور اونکار، رگوید، سام وید، یجروید بھی میں ہی ہوں۔ سب کا پالنے والا، مالک، گواہ، جائے قیام، جائے پناہ، دوست، باعث پیدائش، باعث خاتمہ، باعث قیام، خزانہ اور پیدائش کا لازوال بیج میں ہی ہوں۔ اے ارجن: میں گرمی دیتا ہوں، میں پانی کو روکتا ہوں، میں برساتا ہوں، میں امرت ہوں، اور موت، ست اور است[3] بھی میں ہی ہوں۔" (۹، ۱۷ - ۱۹)

"تمام دیوتا گن[4] اور مہرشی[5] میری پیدائش کو نہیں جانتے۔ کیونکہ سب دیوتاؤں اور مہرشیوں کی ابتداً بہرحال مجھ ہی سے ہے۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ میں (پرتھوی[6] وغیرہ) سب لوکوں[7] کا بڑا ایشور ہوں اور میرا جنم یعنی آغاز نہیں ہے، وہی انسانوں میں موہ[8] سے آزاد ہو کر سب پاپوں سے چھوٹ جاتا ہے" (۱۰: ۲-۳)

"اے گڑاکیش[9]! سب جانداروں میں رہنے والی آتما[10] میں ہوں۔ سب جانداروں کا آغاز، وسط اور انجام بھی میں ہوں۔ بارہ آدیتوں میں وشنو[11] میں ہوں۔ تیجسویوں[12] میں کرنوں کی مالا والا سورج، مرتوں میں مریچی[13] اور

---

[1] وشنو، ہندوؤں کے موجودہ عقائد کے مطابق کائنات کی پرورش کرنے والے خدا یا دیوتا کا نام ہے۔ غالباً اصل میں یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا تصور تھا جسے بعد میں ایک مستقل شخصیت قرار دے دیا گیا۔

[2] واحد کارگزار۔　[3] یعنی سچ اور جھوٹ۔　[4] یعنی دیوتا لوگ۔　[5] یعنی اولیاء۔

[6] زمین۔　[7] لوک یعنی عالم۔　[8] یعنی لگاؤ۔ دنیا کی محبت۔　[9] یعنی اے گھنگھریالے بالوں والے۔ مراد ارجن۔

[10] یعنی تمام جانداروں کی روح۔　[11] ہندوؤں کے تمام دیوتاؤں میں سے ۱۲ دیوتا سب سے بڑے ہیں جن کو آدیتہ کہتے ہیں۔ اور وشنو انھیں میں سب سے بڑا دیوتا ہے۔ یہ ۱۲ آدیتہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ادیتی کے بیٹے تھے۔

[12] تیجسوی۔ یعنی تیز۔　[13] ہندوؤں کی اصطلاح میں مرت ان ۴۹ دیوتاؤں کا نام ہے جو ہوا کا انتظام کرتے ہیں اور ان کے سردار کا نام مریچی ہے۔

نکھشتروں میں چندرما[1] میں ہوں"۔ (۱۰ : ۲۰-۲۱)

"ایسا کوئی متحرک یا ساکن جاندار نہیں جو مجھ سے باہر ہو . . . . . میں صرف اپنے ایک ہی حصہ سے اس تمام جگت میں پھیلا ہوا ہوں"۔ (۱۰ : ۳۹-۴۲)

"ہے پانڈو! جو شخص اس بدھی[2] کے ساتھ کرم[3] کرتا ہے کہ یہ سب کرم میرے یعنی پرمیشور کے ہیں، جو میرا بھروسہ رکھ کر اور سب تعلقات چھوڑ کر سب جانداروں کے بارے میں نرویر (عداوت سے مبرا) ہے وہ میرا بھگت مجھ میں مل جاتا ہے"۔ (۱۱ : ۵۵)

"میں سب جانداروں کا مالک ہوں اور پیدائش سے بالاتر ہوں۔ اگرچہ میرے آتم سروپ[4] میں کبھی تغیر نہیں ہوتا مگر پھر بھی میں اپنی پرکرتی (خاصیت) میں قائم ہو کر اپنی مایا[5] سے جنم لیا کرتا ہوں، ے بھارت[6] جب دھرم کا تنزل ہوتا ہے اور ادھرم کا زور پھیل جاتا ہے تب میں خود ہی جنم لیا کرتا ہوں …ں کی حفاظت اور بدیوں کا ناش کرنے کے لیے اور یگ یگ[7] میں دھرم قائم کرنے کے لیے میں جنم لیا کرتا ہوں"۔ (۴ : ۶-۸)

ان اقوال میں صاف طور پر گیتا کے کرشن نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہے[8]۔ مگر دوسری طرف بھاگوت پران انہی کرشن جی کو اس شکل میں پیش کرتی ہے کہ وہ نہاتے میں گوپیوں کے کپڑے چھپا لیتے ہیں، اُن سے لطف اندوز ہونے کے لیے اتنے ہی جسم پیدا کر لیتے ہیں جتنی گوپیاں تھیں، اور جب مُنک رشی سے راجہ پرکشت پوچھتا ہے کہ "خدا تو اوتار کی شکل میں اس لیے ظاہر ہوتا ہے کہ سچا دھرم پھیلائے، پھر یہ کیسا خدا ہے کہ دھرم کے

[1] یعنی تاروں میں چاند۔ [2] بدھی یعنی شعور۔ [3] یعنی فعل۔ کام۔ [4] یعنی ذات میں کبھی تغیر نہیں ہوتا۔ [5] مایا یعنی قدرت یا تدبیر۔ [6] بھارت یعنی ارجن۔ [7] یگ، یعنی زمانہ۔

[8] اگر گیتا خود اس بات کی مدعی ہوتی کہ وہ خدا کی کتاب ہے اور کرشن اس کے پیش کرنے والے نبی ہیں تو مندرجہ بالا اقوال بشر خدا کے قرار پا سکتے تھے اور کرشن کی طرف خدائی کا دعویٰ منسوب ہوتا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ کتاب خود اپنے آپ کو کرشن کے اپدیش کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔

تمام اصول کے خلاف دوسروں کی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے"؟ تو رشی کو یہ اعتراض رفع کرنے کے لیے اس حیلہ کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے کہ "خود دیوتا بھی بعض اوقات نیکی کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں مگر ان کے گناہ ان کی ذات پر اسی طرح اثر نہیں کرتے جس طرح آگ تمام چیزوں کو جلانے کے باوجود مورد الزام نہیں ہوسکتی"۔ کوئی سلیم العقل آدمی یہ باور نہیں کرسکتا کہ کسی بلند پایہ معلم دین کی زندگی ایسی ناپاک ہوسکتی ہے، اور نہ وہ یہی تصور کرسکتا ہے کہ کسی سچے مذہبی پیشوا نے فی الحقیقت اپنے آپ کو انسانوں کے اور کائنات کے رب کی حیثیت سے پیش کیا ہوگا۔ لیکن قرآن اور بائبل کے متقابل مطالعہ سے یہ حقیقت واضح طور پر ہمارے سامنے روشن ہوجاتی ہے کہ قوموں نے اپنے ذہنی انحطاط اور اخلاقی زوال کے دور میں کس طرح دنیا کے پاکیزہ ترین انسانوں کی سیرتوں کو ایک طرف گندی سے گندی شکل میں ڈھالا ہے تاکہ خود اپنی کمزوریوں کے لیے وجہ جواز پیدا کریں، اور دوسری طرف ان کی شخصیتوں کے گرد کیسے کیسے وہمی افسانے جمع کردیے ہیں۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہی سب کچھ کرشن جی کے ساتھ بھی ہوا ہوگا اور ان کی اصل تعلیم اور اصل شخصیت اس سے بالکل مختلف ہوگی جیسی ہندوؤں کی مذہبی کتابیں اسے پیش کرتی ہیں۔

جن بزرگوں کی نبوت معلوم و مسلّم ہے ان میں سب سے بڑھ کر ظلم سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ ویسے ہی ایک انسان تھے جیسے سب انسان ہوا کرتے ہیں۔ بشریت کی تمام خصوصیتیں ان میں بھی اسی طرح موجود تھیں جس طرح ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت، نبوت اور اعجاز کی قوتیں عطا فرما کر ایک بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کے لیے مامور فرمایا تھا۔ لیکن اول تو ان کی قوم نے ان کو جھٹلایا اور پورے تین سال بھی ان کے وجودِ مسعود کو برداشت نہ کرسکی یہاں تک کہ عین عالمِ شباب میں انھیں قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر جب وہ ان کے بعد ان کی عظمت کی قائل ہوئی تو اس قدر حد سے تجاوز کرگئی کہ ان کو خدا کا بیٹا بلکہ عین خدا بنادیا اور یہ عقیدہ ان کی طرف منسوب کیا کہ خدا مسیح کی شکل میں اس لیے نمودار ہوا تھا کہ صلیب پر چڑھ کر انسان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے کیونکہ انسان فطرۃً گناہ گار تھا اور خود اپنے عمل سے اپنے لیے نجات حاصل نہ کرسکتا تھا۔ معاذ اللہ!

ایک نبی صادق اپنے پروردگار پر اتنا بڑا بہتان کس طرح اٹھا سکتا تھا۔ مگر اس کے معتقدوں نے جوش عقیدت میں اس پر یہ بہتان اٹھایا اور اس کی تعلیمات میں اپنی اہواء نفس کے مطابق اتنی تحریف کی کہ آج دنیا کی کسی کتاب میں (سوائے قرآن کے) مسیح کی اصلی تعلیم اور خود ان کی حقیقت کا نشان نہیں ملتا۔ بائیبل کے عہد جدید میں جو کتابیں اناجیل اربعہ کے نام سے موجود ہیں انہیں اٹھا کر دیکھ جاؤ، سب حلول اور ابنیت اور عینیت کے فاسد تخیلات سے آلودہ ہیں۔ کہیں حضرت مریم کو بشارت ہوتی ہے کہ تیرا بچہ خدا کا بیٹا کہلائے گا (لوقا ۱: ۳۵) کہیں خدا کی روح کبوتر کی مانند یسوع پر اتر کر آتی ہے اور پکار کر کہتی ہے کہ "یہ میرا پیارا بیٹا ہے"۔ (متی ۳: ۱۶) کہیں مسیح خود کہتا ہے کہ "میں خدا کا بیٹا ہوں اور مجھ کو قادر مطلق کے دہنی جانب بیٹھے دیکھو گے" (مرقس ۱۴: ۶۲) کہیں روز جزا میں خدا کے بجائے مسیح کو تخت جلال پر بٹھایا جاتا ہے اور وہ جزا اور سزا کے فرمان نافذ کرتا ہے۔ (متی ۲۵: ۳۱-۴۶) کہیں مسیح کے منہ سے کہلوایا جاتا ہے کہ "باپ مجھ میں ہے اور میں باپ میں ہوں" (یوحنا ۱۰: ۳۸) کہیں اس راست گو انسان کی زبان سے یہ غلط الفاظ نکلوائے جاتے ہیں کہ "میں خدا میں سے نکل کر آیا ہوں" (یوحنا ۸: ۴۲) کہیں اس کو اور خدا کو بالکل ایک کر دیا جاتا ہے اور اس کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا" اور "باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے" (یوحنا ۱۴: ۹-۱۰) کہیں خدا کی تمام چیزیں مسیح کی طرف منتقل کر دی جاتی ہیں (یوحنا ۳: ۳۵) اور خدا اپنی خدائی کا سارا کاروبار مسیح کے سپرد کر دیتا ہے (یوحنا ۵: ۲۰-۲۲)

ان مختلف قوموں نے اپنے پیشواؤں اور ہادیوں کی شخصیتوں پر یہ جتنے بہتان و افترا کے پردے چڑھا لیے ہیں ان کی اصل وجہ یہ ہے کہ اول تو اکثر بزرگوں نے اپنے پیچھے کوئی ایسی کتاب ہی نہیں چھوڑی جس میں ان کی تعلیمات اور خود ان کی شخصیت کے متعلق تمام ضروری باتوں کو بوضاحت بیان کر دیا گیا ہو۔ اور اگر کسی نے کوئی چیز چھوڑی بھی تو اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ ہوا اس لیے تھوڑا زمانہ گذرنے کے بعد اس میں اتنی تحریف و ترمیم ہو گئی کہ اصل اور جعل میں امتیاز کرنا محال ہو گیا۔ پس کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہونے کے باعث نتیجہ یہ ہوا کہ جتنا جتنا زمانہ گذرتا گیا حقیقت پر اوہام غالب آتے گئے اور چند صدیوں میں ساری حقیقت گم ہو گئی، صرف افسانے ہی افسانے باقی رہ گئے۔

دنیا کے تمام ہادیوں میں یہ خصوصیت صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے کہ آپ کی شخصیت ۱۳ صدیوں سے بالکل اپنے حقیقی رنگ میں نمایاں ہے اور قدرت کی طرف سے ایسا انتظام کر دیا گیا ہے کہ قیامت تک نمایاں رہے گی۔ انسان کی اوہام پرستی و اعجوبہ پسندی سے بعید نہ تھا کہ وہ اس برگزیدہ ہستی کو بھی، جو کمال کے سب سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ چکی تھی، افسانہ بنا کر الوہیت سے کسی نہ کسی طرح متصف کر ڈالتی اور پیروی کے بجائے محض ایک تحیر و استعجاب اور عبادت و پرستش کا موضوع بنا لیتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو بعثت انبیاء کے آخری مرحلہ میں ایک ایسا ہادی و رہنما بھیجنا منظور تھا جس کی ذات انسان کے لیے دائمی نمونۂ عمل اور عالمگیر سرچشمۂ ہدایت ہو، اس لیے اس نے محمد ابن عبداللہ علیہ الف الف تحیۃ وسلام کے ساتھ ایک ایسی واضح ہدایت بھیجی جس میں آپ کی تعلیم، آپ کی رسالت، آپ کی شخصیت، اور ہر اس چیز کو جس کا جاننا آپ کی دعوت کو ٹھیک ٹھیک جاننے کے لیے ضروری ہو، بیان کر دیا اور اس طرح بیان کر دیا کہ کسی شک و شبہ اور تحریف و تلبیس کی گنجائش نہ رہی۔

یوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ و تابعین اور بعد کے محدثین نے آپ کے اقوال و افعال، آپ کے شمائل و خصائل اور آپ کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک کو اس طرح محفوظ کیا ہے کہ آج تک دنیا کے کسی انسان کی زندگی کے متعلق اتنی تفصیلات محفوظ نہیں رہیں اور اس بنا پر بلا شائبۂ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ کی تمام شخصیتوں میں صرف ایک رسولِ عربی کی ذات ہی ایسی ہے جس کو ہم ساڑھے تیرہ سو برس گذر جانے پر بھی آج تقریباً اتنے ہی قریب سے دیکھ سکتے ہیں جتنے قریب سے خود آپ کے عہد کے لوگ دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اگر کتابوں کا وہ تمام ذخیرہ دنیا سے مٹ جائے جو ائمۂ اسلام نے سالہا سال کی محنتوں سے مہیا کیا ہے، حدیث و سیر کا ایک ورق بھی دنیا میں نہ رہے جس سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہو، اور صرف قرآن ہی قرآن باقی رہ جائے، تب بھی ہم اس کتاب سے اُن تمام بنیادی سوالات کا جواب حاصل کر سکتے ہیں جو اس کے لانے والے کے متعلق ایک طالب علم کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ قرآن اپنے لانے والے کو کس رنگ میں پیش کرتا ہے۔

۱۔ قرآن مجید نے سب سے پہلے جس مسئلہ کو انتہائی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے وہ رسول کی بشریت ہے۔ نزول قرآن سے پہلے صدیوں کے معتقدات نے یہ ایک طے شدہ مسئلہ بنا دیا تھا کہ انسان کبھی اللہ کا رسول اور نائب نہیں بن سکتا، دنیا کی اصلاح کے لیے جب کبھی ضرورت ہوتی ہے خدا خود ہی انسان کی صورت میں ظاہر ہوا کرتا ہے، یا کسی فرشتے یا دیوتا کو بھیج دیتا ہے، اور یہ کہ جتنے بزرگ دنیا میں اصلاح کے لیے آئے ہیں وہ سب کے سب فوق البشری ہستی تھے۔ اس عقیدے نے انسان میں اتنی گہری جڑیں پکڑ لی تھیں کہ جب کبھی اللہ کا کوئی نیک بندہ لوگوں کو اللہ کا کوئی پیغام پہنچانے کے لیے آتا تو سب سے پہلے لوگ حیرت سے پوچھتے تھے کہ یہ کیسا نبی ہے جو ہماری طرح کھاتا پیتا، سوتا اور چلتا پھرتا ہے؟ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ ہماری طرح تمام عوارض اس کو بھی لاحق ہوتے ہیں؟ بیمار ہوتا ہے، تکلیف و راحت میں مبتلا ہوتا ہے اور رنج و مسرت سے متاثر ہوا کرتا ہے۔ اگر اللہ کو ہماری ہدایت مقصود ہوتی تو وہ ہم جیسا ایک کمزور انسان کیوں بھیجتا؟ کیا خدا خود نہیں آسکتا تھا؟ یہ سوالات ہر نبی کی بعثت پر پیدا ہوتے تھے اور انہی کو حجت بنا کر یہ لوگ انبیاء کا انکار کیا کرتے تھے۔ حضرت نوح جب اپنی قوم کی طرف پیغام لے کر آئے تو کہا گیا

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً مَّا سَمِعْنَا بِھٰذَا فِيْٓ اٰبَاۗىِٕنَا الْاَوَّلِيْنَ (مومنون - ۲)

یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تم ہی جیسا ایک انسان ہے جو تم پر فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ اگر خدا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا۔ یہ انوکھی بات تو ہم نے اپنے بزرگوں سے کبھی نہیں سنی۔

جب حضرت ہود اپنی قوم کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تو ان پر بھی سب سے پہلے یہی اعتراض ہوا

مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ وَلَىِٕنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ (مومنون - ۳)

یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا، وہی کچھ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو اور وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو۔ اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو بڑے ٹوٹے میں رہو گے۔

حب حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون کے پاس صداقت کا پیغام لے کر پہنچے تو ان کی بات ماننے سے بھی اسی بنا پر انکار کیا گیا:

أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا (مومنون ۔ ۳)	کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں؟

چنانچہ ٹھیک یہی سوال اس وقت بھی اٹھا جب مکہ کے ایک امی انسان نے ۴۰ برس تک خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد دفعتاً اعلان کیا کہ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا ۔ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ ایک شخص جو ہماری طرح ہاتھ پاؤں، آنکھ ناک اور جسم و جان رکھتا ہے، کیونکر اللہ کا رسول ہو سکتا ہے۔ وہ حیران ہو کر پوچھتے تھے کہ

مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ، لَوْلَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا (الفرقان ۔ ۱)	یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس پر کوئی فرشتہ اُترا کہ اس کے ساتھ رہ کر لوگوں کو ڈراتا؟ یا کم از کم اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اتارا جاتا، یا اس کے پاس کوئی باغ ہوتا جس کے پھل یہ کھاتا۔

پس اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اسی عقیدے کی بیخ کنی کی اور دلائل کے ساتھ بتایا کہ انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی زیادہ موزوں ہو سکتا ہے، کیونکہ بعثت کا مقصود صرف تعلیم ہی دینا نہیں ہے بلکہ خود عمل کر کے دکھانا اور تقلید و پیروی کے لیے ایک نمونہ پیش کرنا بھی ہے اور اس مقصد کے لیے اگر فرشتہ یا اور کوئی فوق البشری ہستی بھیجی جائے جس میں بشری خصائص اور کمزوریاں موجود نہ ہوں تو انسان کہہ سکتا ہے کہ ہم اس کی طرح کیونکر عمل کر سکتے ہیں جب کہ وہ ہماری طرح نفس اور نفسانی خواہشات ہی نہیں رکھتا اور اس کی فطرت میں وہ قوتیں ہی نہیں ہیں جو انسان کو گناہ کی طرف راغب کرتی ہیں۔

لَوْ كَانَ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يَمْشُونَ مُطْمَئِنِّينَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِم مِّنَ	اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے آباد ہوتے تو البتہ آسمان سے ہم بھی فرشتے ہی اُتارتے۔

السَّمَاءِ مَلَكًا رَّسُولًا (بنی اسرائیل - ۱۱)

پھر صاف طور پر تصریح کی کہ اس سے پہلے جتنے انبیاء اور ہادیان حق مختلف قوموں میں بھیجے گئے ہیں وہ سب ایسے ہی انسان تھے جیسے محمد رسول اللہ ہیں اور اسی طرح کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے تھے جس طرح ہر انسان کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہے۔

مَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ۔ (انبیاء - ۱)

ہم نے تم سے پہلے جن لوگوں کو بھیجا تھا وہ بھی آدمی ہی تھے جن پر ہم وحی نازل کرتے تھے، اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو۔ اور ہم نے ان انبیاء کو ایسے جسم نہیں دیے تھے کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ غیر فانی تھے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ (الفرقان - ۲)

اور ہم نے تم سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے وہ سب کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً (الرعد - ۶)

ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے تھے اور ان کے لیے ہم نے بیویاں بھی پیدا کی تھیں اور ان کو اولاد بھی دی تھی

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ تم اپنے بشر ہونے کا صاف اعلان کرو تاکہ آپ کے بعد لوگ آپ کو بھی اسی طرح الوہیت سے متصف نہ کرنے لگیں جس طرح آپ سے پہلے دوسرے انبیاء کو کر چکے ہیں چنانچہ قرآن مجید میں متعدد جگہ یہ آیت آئی ہے:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ۔

اے محمد! کہہ دو کہ میں تو محض تمہی جیسا ایک انسان ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔

ان تصریحات نے صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے متعلق تمام فاسد عقائد کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ تمام انبیاء سابقین و بزرگانِ دین کی ذات سے بھی اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا۔

۲۔ دوسری چیز جس کو نہایت وضاحت کے ساتھ قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے نبی کی قوت و قدرت کا مسئلہ ہے جہل و نادانی نے جب خدا رسیدگی کو خدائی کا ہم معنی بنا دیا تو طبعاً اس کے ساتھ یہ عقیدہ بھی پیدا ہو گیا کہ خدا رسیدہ لوگوں میں غیر معمولی طاقتیں ہوتی ہیں، خدا کے کارخانہ میں ان کو کچھ خاص اختیارات حاصل ہوتے ہیں، جزا و سزا میں ان کو دخل ہوتا ہے، غیب و شہادت سب کچھ ان پر روشن ہوتا ہے، قسمتوں کے فیصلے ان کی مرضی و رائے سے ادلتے بدلتے ہیں، نفع و ضرر پر ان کا اقتدار ہوتا ہے، خیر و شر کے وہ مالک ہوتے ہیں، کائنات کی تمام قوتیں ان کے تابع ہوتی ہیں اور وہ بیک نظر لوگوں کے دلوں کو بدل کر ان کی ظلمت و ضلالت کو دور کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی خیالات تھے جن کی بنا پر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل - ۱۰)

انھوں نے کہا ہم تو تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین میں سے ایک چشمہ نہ نکال دو، یا تمھارے لیے کھجور اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو اور اس میں تم نہریں رواں کر دو، یا جیسا کہ تم کہا کرتے ہو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دو، یا اللہ اور ملائکہ کو ہمارے سامنے لا کھڑا کر دو، یا تمھارے لیے سونے کا ایک گھر بن جائے، یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ، اور ہم تمھارے چڑھنے پر بھی اس وقت تک یقین نہ کریں گے جب تک کہ تم ہمارے اوپر ایسی ایک تحریر نازل نہ کر دو جسے ہم پڑھیں۔ اے محمد! ان سے کہو، پاک ہے میرا رب، میں ایک انسان کے سوا اور کیا ہوں۔

خدا رسیدگی اور بزرگی کے متعلق یہ جتنے غلط تصورات لوگوں میں پائے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان سب کی تردید فرمائی اور صاف بتا دیا کہ رسول کا خدائی طاقتوں اور خدائی کاموں میں ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں ہے۔

فرمایا نبی ہمارے اذن کے بغیر دوسروں کو ضرر سے بچانا تو درکنار خود اپنے آپ سے بھی ضرر کو دفع کرنے کی قدرت نہیں رکھتا:

وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهُ إِلَّا هُوَ وَإِن يَمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (انعام - ۲)

اے نبی! اگر خدا تمہیں کوئی نقصان پہنچائے تو اُس کے سوا کوئی اس نقصان کو دور کرنے والا نہیں ہے، اور اگر وہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي ضَرًّا وَلَا نَفْعًا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ۔ (یونس - ۵)

اے محمد! کہو، میں اپنی ذات کیلئے بھی نفع یا نقصان کی قدرت نہیں رکھتا سوائے اُس کے جو خدا چاہے۔

فرمایا نبی کے پاس اللہ کے خزانوں کی کنجیاں نہیں ہیں، نہ وہ علم غیب رکھتا ہے اور نہ اس کو فوق العادۃ قوتیں حاصل ہیں:

قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (انعام - ۵)

اے محمد! کہو، میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں، نہ میں غیب کا حال جانتا ہوں، اور میں تم کو یہ بھی نہیں کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اُس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔

وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَا إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ۔ (اعراف - ۲۳)

اور اگر میں غیب جاننے والا ہوتا تو اپنے لیے بہت کچھ دولت اکٹھی کر لیتا اور مجھ کو کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک متنبہ کرنے والا اور ایمان والوں کو خوشخبری دینے والا ہوں۔

فرمایا نبی کو حساب کتاب اور جزا و سزا میں بھی کچھ دخل نہیں، اس کا کام صرف پیغام پہنچانا اور سیدھی راہ دکھا دینا ہے۔

مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِم مِّن شَيْءٍ (انعام - ۶)	تم پر نہ ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری ہے اور نہ ان پر تمہارے حساب میں سے کسی چیز کی۔
فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد - ۶)	تمہارا کام پیغام پہنچانا ہے اور حساب کرنا ہمارا کام ہے۔
إِنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍ (۹ : ۴)	ہم نے لوگوں (کی ہدایت) کے لیے تم پر کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے۔ پھر جو کوئی ہدایت قبول کرتا ہے تو اپنے لیے کرتا ہے اور جو گمراہی میں پڑتا ہے تو اپنے ہی اوپر گمراہی کا وبال اٹھاتا ہے۔ تم ان پر کوئی حوالہ دار نہیں ہو۔

فرمایا لوگوں کے دلوں کو پھیر دینا اور جن لوگوں میں قبول حق کی آمادگی نہ ہو ان میں اسے پیدا کر دینا نبی کے بس کی بات نہیں ہے، وہ ہادی صرف اس معنی میں ہے کہ نصیحت اور تذکیر کا جو حق ہے اس کو وہ پورا پورا ادا کر دیتا ہے:

إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِينَ وَمَا أَنتَ بِهَادِي الْعُمْيِ عَن ضَلَالَتِهِمْ إِن تُسْمِعُ إِلَّا مَن يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُم مُّسْلِمُونَ (النمل - ۶)	تم مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ بہروں تک آواز پہنچا سکتے ہو جبکہ وہ پیٹھ پھیر کر لوٹ جائیں۔ اور نہ تم اندھوں کو گمراہی سے نکال کر سیدھے راستہ پر ڈال سکتے ہو۔ تم تو صرف انہی لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری نشانیوں پر ایمان لاتے ہیں۔ پھر سرِ اطاعت جھکا دیتے ہیں۔
وَمَا أَنتَ بِمُسْمِعٍ مَّن فِي الْقُبُورِ	تم قبر کے مردوں کو سنانے والے نہیں ہو، تم تو صرف آگاہ

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (فاطر - ۳)	کو ڈرانے والے ہو اور ہم نے تم کو حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

پھر یہ بھی صاف بتا دیا کہ نبی کو جو کچھ قدر و عزت اور علو مرتبت حاصل ہے سب اس بنا پر ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے، اس کے احکام پر ٹھیک ٹھیک چلتا ہے اور جو کچھ کلام اس پر نازل کیا جاتا ہے اسے جوں کا توں اللہ کے بندوں تک پہنچا دیتا ہے۔ ورنہ اگر وہ اطاعت سے منہ موڑے اور اللہ کے کلام میں اپنے دل سے گھڑ کر باتیں ملا دے تو اس کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ - (بقرہ - ۱۷)	اور اگر تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اس علم کے باوجود جو تمھارے پاس آگیا ہے تو یقیناً اس صورت میں تم ظالم ہوگے۔
وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (بقرہ - ۱۴)	اور اگر تم نے اس علم کے باوجود جو تمھارے پاس آیا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو تمھیں اللہ کی سزا سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار نہ ہوگا۔
قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (یونس - ۲)	اے محمد! ان سے کہو مجھ کو اس کلام میں اپنی طرف سے کچھ رد و بدل کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے

یہ باتیں اس لیے نہیں کہی گئیں کہ معاذ اللہ رسول اکرم سے کسی نافرمانی یا تحریف و تلبیس کا ادنیٰ سا اندیشہ بھی تھا۔ ان سے تو دنیا کو صرف یہ بتانا مقصود تھا کہ نبی کو بارگاہ رب العزت میں جو تقرب حاصل ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی ذات سے اللہ کو کوئی خاص تعلق ہے بلکہ اصل وجہ ان کی اطاعت

و بندگی اور ان کا عمل خیر ہے۔

۳۔ تیسری چیز جس کا بار بار نہایت صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں ذکر کیا گیا ہے یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نئے نبی نہیں ہیں بلکہ جماعت انبیاء کے ایک فرد اور اس سلسلۂ نبوت کی ایک کڑی ہیں جو ابتدائے آفرینش سے لے کر آپ کی بعثت تک جاری رہا اور جس میں ہر قوم اور ہر زمانہ کے انبیاء و رسل شامل ہیں۔ قرآن حکیم نبوت و رسالت کو کسی ایک ذات یا ایک ملک یا ایک قوم سے مخصوص نہیں کرتا بلکہ وہ صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور ہر ملک اور ہر زمانہ میں ایسے مقدس نفوس پیدا کیے ہیں جنھوں نے انسان کو صراط مستقیم کی طرف دعوت دی ہے اور گمراہی کے برے نتائج سے ڈرایا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر-۳)	کوئی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ گذرا ہو۔
وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل-۵)	اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا جس نے پیغام دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے پرہیز کرو۔

انھی پیغمبروں اور ڈرانے والوں میں سے ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى (النجم-۳)	یہ ایک ڈرانے والا ہے اگلے ڈرانے والوں میں سے۔
اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (یٰس-۱)	اے محمد! یقیناً تم پیغمبروں میں سے ہو۔
قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (احقاف-۱)	اے محمد! کہو، میں کوئی نرالا رسول نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ برتا جائے گا اور تمھارے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ میں تو اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے اور میں محض ایک ڈرانے والا ہوں صاف صاف۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (آل عمران - ۱۵)	محمد کچھ نہیں ہے مگر ایک رسول اور اس سے پہلے بھی رسول گذر چکے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ رسول عربی کی دعوت وہی دعوت ہے جس کی طرف ابتدائے آفرینش سے ہر داعی حق بلاتا رہا ہے اور آپ اسی دین فطرت کی تلقین کرتے ہیں جس کی تلقین ہمیشہ اللہ کے ہر نبی و رسول نے کی ہے۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (بقرہ - ۱۶)	کہو، ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس تعلیم پر جو ہماری طرف اتاری گئی ہے اور اس تعلیم پر جو ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اتاری گئی تھی اور جو موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مطیع فرمان ہیں پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو تو وہ سیدھے راستے پر ہیں۔

قرآن مجید کی یہ تصریحات اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رکھتیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پچھلے پیغمبروں میں سے کسی کی تکذیب یا کسی کے لائے ہوئے پیغام کی تردید کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ اس لیے آئے تھے کہ اُسی سچے مذہب کو جو اول دن سے تمام قوموں کے پیغمبر پیش کرتے چلے آئے تھے بعد کے لوگوں کی ملاوٹوں سے پاک اور مکمل کر کے پیش کریں۔

۴ - اس طرح قرآن مجید اپنے لانے والے کی صحیح حیثیت واضح کرنے کے بعد اُن کاموں کی تفصیل بیان کرتا ہے جن کے لیے اللہ نے اسے بھیجا تھا۔

یہ کام بحیثیت مجموعی دو شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک شعبہ تعلیمی اور دوسرا شعبہ عملی۔

پہلے شعبہ کے کام حسب ذیل ہیں :-

(۱) تلاوتِ آیات، تزکیہ نفوس، اور تعلیم کتاب و حکمت :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (آل عمران - ۱۷)

اللہ نے درحقیقت ایمان داروں پر یہ احسان کیا کہ ان کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا رسول اٹھایا جو انھیں اُس کی آیات سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

تلاوتِ آیات سے مراد اللہ کے فرامین اور ارشادات کو جوں کا توں سنا دینا ہے۔ تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے اخلاق اور ان کی زندگی کو بری صفات، بری رسموں اور برے طریقوں سے پاک کیا جائے اور ان کے اندر اچھے اوصاف، پاکیزہ اخلاق اور صحیح طریقوں کو نشو و نما دیا جائے۔ تعلیم کتاب و حکمت یہ ہے کہ لوگوں کو خدا کی کتاب کا صحیح منشا و مدعا سمجھایا جائے، ان کے اندر ایسی بصیرت پیدا کی جائے کہ وہ کتاب کی اصل روح تک پہنچ سکیں اور انھیں وہ حکمت سکھائی جائے جس سے وہ اپنی زندگی کے تمام مختلف و سعت پذیر پہلوؤں کو کتاب اللہ کے مطابق ڈھالتے چلے جائیں۔

(۲) تکمیل دین :

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ - ۱)

آج میں نے تمھارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کے طریقے کو پسند کیا

دوسرے الفاظ میں قرآن کے بھیجنے والے نے اس کے لانے والے سے صرف اتنی ہی خدمت نہیں لی کہ وہ اس کی آیات کی تلاوت کرے، نفوس کا تزکیہ کرے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے، بلکہ اس نے اپنے اسی

نیک بندے کے ذریعہ سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ جو آیات نوعِ انسان تک بھیجنی تھیں وہ سب اُس کے واسطہ سے بھیج دیں۔ جن خرابیوں سے انسانی زندگی کو پاک کرنا مقصود تھا وہ سب اس کے ہاتھوں سے دور کرا کے دکھا دیں۔ جن خوبیوں کا نشو ونما جس شان کے ساتھ افراد اور سوسائٹی میں ہونا چاہیے تھا اس کا بہترین نمونہ اس کی رہنمائی میں پیش کرا دیا، اور کتاب و حکمت کی ایسی تعلیم اس کے ذریعہ سے دلوا دی کہ آنے والے تمام زمانوں میں مقصودِ کتاب کے مطابق انسانی زندگی کی تشکیل و تعمیر کی جا سکتی ہے۔

(۳) اُن اختلافات کی حقیقت واضح کرنا جو اصل دینِ حق میں پچھلے انبیاء کی امتوں کے درمیان پیدا ہو گئے تھے، اور تمام پردوں کو ہٹا کر تمام آمیزشوں کو چھانٹ کر، تمام الجھنوں کو صاف کر کے اس راہِ وسط کو پوری روشنی میں نمایاں کر دینا جس کی پیروی ہمیشہ سے خدا کی رضا کو پہنچنے کی ایک ہی راہ رہی ہے:

تَاللّٰهِ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن
قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ
فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ
وَمَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ
لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَ
رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (النحل - ۸)

بخدا کہ ہم نے (اے محمد!) تم سے پہلے مختلف امتوں کی طرف ہدایت بھیجی، مگر اس کے بعد شیطان نے ان کے غلط اعمال کو ان کے لیے خوشنما بنا دیا، چنانچہ آج وہی ان کا سرپرست بنا ہوا ہے اور وہ دردناک عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں۔ اور ہم نے تم پر یہ کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ اس حقیقت کو اُن کے سامنے واضح کر دو جس میں وہ مختلف ہو گئے ہیں، اور اس لیے کہ یہ کتاب ہدایت اور رحمت ہو ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا
يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ
الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءَكُم مِّنَ
اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ يَهْدِي بِهِ

اے اہلِ کتاب تمہارے پاس ہمارا رسول آگیا ہے جو تمہارے سامنے بہت سی اُن چیزوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جنھیں تم کتاب میں سے چھپاتے ہو، اور بہت سی باتوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک

اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (المائدہ-۳)

روشنی اور ایک واضح کرنے والی کتاب آگئی ہے جس کے ذریعہ سے اللہ ان لوگوں کو جو اس کی پسند کے مطابق چلتے ہیں امن وسلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور انھیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال لاتا ہے، اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

(۴) نافرمانوں کو ڈرانا، فرماں برداروں کو رحمتِ الٰہی کی خوشخبری دینا اور اللہ کے دین کی اشاعت کرنا۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (احزاب-۶)

اے نبی! ہم نے تم کو گواہ اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

دوسرا شعبہ عملی زندگی اور اس کے معاملات سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے کام یہ ہیں:

نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، حرام وحلال کی حدود قائم کرنا اور انسان کو خدا کے سوا دوسروں کی عائد کردہ پابندیوں سے آزاد اور ان کے لادے ہوئے بوجھوں سے ہلکا کرنا:

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (اعراف-۱۹)

وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے اور ان بندشوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ دبے اور جکڑے ہوئے تھے۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت کریں اور اس کی مدد کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

بندگانِ خدا میں حق اور عدل کے ساتھ فیصلہ کرنا۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا (النساء - ۱۶)

اے محمد! ہم نے تم پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم اللہ کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرو اور خیانت کرنے والوں کے وکیل نہ بنو۔

۔۔۔ اللہ کے دین کو اس طرح قائم کر دینا کہ انسانی زندگی کا پورا نظام اسی کا تابع ہو اور دوسرے سب طریقے اس کے مقابلے میں دب کر رہ جائیں:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (الفتح - ۴)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے۔

اس طرح نبی کے کام کا یہ شعبہ سیاست، عدالت، اصلاح اخلاق و تمدن، اور قیام تہذیب صالح کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہو جاتا ہے۔

۵۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کام کسی ایک قوم یا ملک یا دور کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام نوع انسانی کے لیے اور تمام زمانوں کے لیے عام ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (السبا - ۳)

اے محمد! ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے ڈرانے والا اور بشارت دینے والا بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ

اے محمد! کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں، اُس خدا کا جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے، جس کے سوا کوئی خدا نہیں، جو مارنے اور جلانے والا ہے، پس ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول نبیِ اُمّی پر جو خدا

الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (الاعراف — ۲۰)	اور اس کے فرامین پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی پیروی کرو، امید ہے کہ تم راہ راست پاؤ گے۔
وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ لِأُنذِرَكُم بِهِ وَمَن بَلَغَ (الانعام — ۲)	(اے محمد! کہو) اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے تم کو متنبہ کروں اور جس جس کو یہ پہنچے۔
إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ (التکویر)	یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لیے، ہر اس شخص کے لیے جو تم میں سے راست رو بننا چاہے۔

۶- عمومیتِ دعوت کے ساتھ نبی اکرم کے پیغام کی ایک یہ خصوصیت بھی قرآن حکیم ہم کو بتاتا ہے کہ وہ دائمی پیغام تھا جس کے بعد عالم انسانی کو خدا کی طرف سے کسی دوسرے پیغام کی ضرورت نہ رہی اور قدرتی طور پر دنیا آپ کے بعد پیغمبروں کی بعثت سے بھی مستغنی ہو گئی اس لیے آپ دنیا میں اللہ کے آخری نبی ہیں:

مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (احزاب ۵)	محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر اللہ کے رسول اور سلسلۂ نبوت کے ختم کرنے والے ہیں۔

اس ختم نبوت کے مضمون کو خود نبی صلی اللہ وسلم نے بہترین اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ میری مثال نبیوں میں ایسی ہے جیسے کسی شخص نے ایک نہایت خوبصورت مکان بنایا اور تمام عمارت بنا کر صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی اب جو لوگوں نے اس کے گرد چکر لگایا تو وہ خالی جگہ انھیں کھٹکنے لگی اور وہ کہنے لگے کہ اگر یہ آخری اینٹ بھی رکھ دی جاتی تو مکان مکمل ہو جاتا۔ سو وہ آخری اینٹ جس کی جگہ نبوت کے محل میں باقی رہ گئی تھی میں ہی ہوں اور اب میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس مثال سے ختم نبوت کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ جب دین کامل ہو چکا، آیات الٰہی پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکیں، اوامر و نواہی، عقائد و عبادات، تمدن و معاشرت، حکومت و سیاست، غرض انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق پورے پورے احکام بیان کر دیے گئے، اور دنیا کے سامنے اللہ کا کلام اور اللہ کے رسول کا اسوۂ حسنہ اس طرح پیش

کردیا گیا کہ ہر قسم کی تلبیس و تحریف سے پاک ہے اور ہر عہد میں اس سے ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے تو نبوت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی، صرف تجدید و تذکیر کی ضرورت رہ گئی ہے جس کے لیے علمائے حق کی جماعت کافی ہے۔

۷۔ آخری سوال جو دریافت طلب رہ جاتا ہے یہ ہے کہ اس کتاب کا لانے والا ذاتی طور پر کس قسم کے اخلاق کا انسان تھا؟ اس سوال کے جواب میں قرآن مجید نے دوسری رائج الوقت کتابوں کی طرح اپنے لانے والے کی تعریف کے پل نہیں باندھے ہیں، نہ آپ کی تعریف کو ایک مستقل موضوعِ گفتگو بنایا ہے۔ البتہ آثنائے سخن میں محض اشارۃً آنحضرت کی اخلاقی خصوصیات ظاہر کی ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس وجودِ مسعود میں کمالِ انسانیت کے بہترین خصائص موجود تھے۔

(۱) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا اخلاق کے نہایت بلند مقام پر تھا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (ن ۔ ۱)	اور اے محمدؐ یقیناً تم اخلاق کے بڑے درجے پر ہو۔

(۲) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا ایک ایسا راسخ العزم، مستقیم الارادہ اور اللہ پر ہر حال میں بھروسہ رکھنے والا انسان تھا کہ جس وقت اس کی ساری قوم اسے مٹا دینے پر آمادہ ہو گئی تھی اور وہ صرف ایک مددگار کے ساتھ ایک غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوا تھا، اس سخت مصیبت کے وقت میں بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے عزم پر قائم رہا:

اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (توبہ ۔ ۶)	جب کافروں نے اس کو نکال دیا، جب کہ وہ غار میں صرف ایک آدمی کے ساتھ تھا، جبکہ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ رنج نہ کر، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

(۳) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا ایک نہایت فراخ حوصلہ اور فیاض انسان تھا جس نے اپنے بدترین دشمنوں کے لیے بھی بخشش کی دعا کی اور آخر اللہ تعالیٰ کو اسے اپنا یہ قطعی فیصلہ سنا دینا پڑا کہ وہ ان لوگوں کو نہیں بخشے گا:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ	چاہے تم ان کے لیے معافی مانگو چاہے نہ مانگو، اگر تم ستر

إِن تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ (توبہ ــ ۱۰)	بار بھی ان کے لیے معافی مانگو گے تب بھی اللہ ان کو معاف نہ کرے گا۔

(۴) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کا مزاج نہایت نرم تھا، وہ کبھی کسی کے ساتھ درشتی سے پیش نہیں آتا تھا اور اسی لیے دنیا اس کی گرویدہ ہو گئی تھی:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران ــ ۱۷)	اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان کے ساتھ نرم ہو ورنہ اگر تم زبان کے تیز اور دل کے سخت ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے گرد و پیش سے چھٹ کر الگ ہو جاتے۔

(۵) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا بندگانِ خدا کو راہِ راست پر لانے کی سچی تڑپ دل میں رکھتا تھا اور ان کی گمراہی پر اصرار کرنے سے اس کی روح کو صدمہ پہنچتا تھا حتیٰ کہ وہ ان کے غم میں گھلا جاتا تھا۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهَٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفًا (الکہف ــ ۱)	اے محمدؐ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم ان کے پیچھے رنج و غم میں اپنی جان کھو دو گے اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائے۔

(۶) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کو اپنی امت سے بے حد محبت تھی، وہ ان کی بھلائی کا حریص تھا، ان کے نقصان میں پڑنے سے کڑھتا تھا، اور ان کے حق میں سراپا شفقت و رحمت تھا:

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (توبہ ــ ۱۶)	تمہارے پاس خود تم ہی میں سے ایک ایسا رسول آیا ہے جسے ہر وہ چیز شاق گذرتی ہے جس سے تم مضرت میں مبتلا ہو، جو تمہاری فلاح کا حریص ہے اور ایمان داروں کے ساتھ نہایت شفیق اور رحیم ہے۔

(۷) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا صرف اپنی قوم ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالم کے لیے اللہ کی رحمت تھا:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (انبیاء - ۷)

اے محمد! ہم نے تو تم کو تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

(۸) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا راتوں کو گھنٹوں اللہ کی عبادت کرتا اور خدا کی یاد میں کھڑا رہتا تھا:

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ (المزمل - ۲)

اے محمد! تمھارا رب جانتا ہے کہ تم رات کو تقریباً دو تہائی حصے تک، اور کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی حصے تک نمازمیں کھڑے رہتے ہو۔

(۹) وہ بتاتا ہے کہ اس کا لانے والا ایک سچا انسان تھا، نہ کبھی اپنی زندگی میں راہِ حق سے بھٹکا، نہ فاسد خیالات سے متأثر ہوا اور نہ کبھی ایک لفظ خواہشِ نفس کی پیروی میں حق کے خلاف زبان سے نکالا:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ (النجم - ۱)

لوگو! تمھارا صاحب نہ کبھی سیدھی راہ سے بھٹکا اور نہ صحیح خیالات سے بہکا اور نہ خواہشِ نفس سے بولتا ہے۔

(۱۰) وہ بتاتا ہے کہ اس کے لانے والے کی ذات تمام عالم کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ تھی اور اس کی پوری زندگی کمالِ اخلاق کا صحیح معیار تھی:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب - ۳)

تمھارے لیے رسول اللہ کی ذات میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

قرآن مجید کا تتبع کرنے سے صاحبِ قرآن کی بعض اور خصوصیات پر بھی روشنی پڑتی ہے لیکن اس مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ جو کوئی قرآن کا مطالعہ کرے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ بخلاف دوسری موجود الوقت مذہبی کتابوں کے یہ کتاب اپنے لانے والے کو جس رنگ میں پیش کرتی ہے وہ کس قدر صاف، واضح، اور آلودگی سے پاک ہے۔ اس میں نہ اُلوہیت کا کوئی شائبہ ہے، نہ تعریف و ثنا میں مبالغہ ہے، نہ غیر معمولی قوتیں آپ کی طرف منسوب کی گئی ہیں،

نہ آپ کو خدا کے کاروبار میں شریک و سہیم بنایا گیا ہے، اور نہ آپ کو ایسی کمزوریوں سے متہم کیا گیا ہے جو ایک ہادی اور داعی الی الحق کی شان سے گری ہوئی ہوں۔ اگر اسلامی لٹریچر کی دوسری تمام کتابیں دنیا سے ناپید ہو جائیں اور صرف قرآن مجید ہی باقی رہ جائے تب بھی رسولِ اکرم کی شخصیت کے متعلق کسی غلط فہمی، کسی شک و شبہ اور کسی لغزش عقیدت کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ ہم اچھی طرح معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کتاب کا لانے والا ایک کامل انسان تھا، بہترین اخلاق سے متصف تھا، انبیاء سابقین کی تصدیق کرتا تھا، کسی نئے مذہب کا بانی نہ تھا اور کسی فوق البشر حیثیت کا مدعی نہ تھا۔ اس کی دعوت تمام عالم کے لیے تھی، اس کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے چند مقرر خدمات پر مامور کیا گیا تھا اور جب اس نے ان خدمات کو پوری طرح انجام دے دیا تو نبوت کا سلسلہ اس کی ذات پر ختم ہو گیا۔

اطلاع

ہمارے دفتر میں "ترجمان القرآن" کے کچھ پرانے پرچے موجود ہیں جن صاحب کو ضرورت ہو طلب فرمالیں قیمت آٹھ آنے فی پرچہ۔ فہرست سال وار مندرجہ ذیل ہے:

۱۳۵۲ھ ۔ صفر۔ ربیع الاول۔ ربیع الثانی۔ جمادی الاولیٰ۔ جمادی الآخرہ۔ رجب۔ شوال۔ ذوالقعدہ۔ ذوالحجہ۔

۱۳۵۳ھ ۔ از محرم لغایۃ ذوالحجہ (مکمل فائل)

۱۳۵۴ھ ۔ جمادی الاولیٰ۔ جمادی الآخرہ۔ رجب۔ شعبان۔ رمضان۔ شوال۔

۱۳۵۵ھ ۔ ربیع الاول۔ ربیع الثانی۔ جمادی الاولیٰ۔ رجب۔ شعبان۔ رمضان۔ شوال۔ ذوالقعدہ۔

۱۳۵۶ھ ۔ شوال۔

۱۳۵۷ھ ۔ محرم۔ صفر۔ ربیع الاول۔ ذوالقعدہ۔

۱۳۵۸ھ ۔ صفر۔ جمادی الآخرہ۔ رجب۔ شعبان۔

۱۳۶۰ھ ۔ ربیع الثانی۔ جمادی الاولیٰ۔ جمادی الآخرہ۔ رجب۔ شعبان۔ رمضان۔ شوال۔ ذوالقعدہ۔ ذوالحجہ۔

۱۳۶۱ھ ۔ ربیع الثانی۔ رمضان۔ شوال۔ ذوالقعدہ۔ ذوالحجہ۔

۱۳۶۲ھ ۔ (مکمل فائل)

منیجر رسالہ "ترجمان القرآن"

خطبۂ تقسیمِ اَسناد

[کچھ مدت ہوئی، مجھے ایک اسلامیہ کالج کے جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ عرض کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس موقع پر میں نے جو کچھ عرض کیا تھا اسے فائدہ عام کی خاطر ان صفحات میں نقل کیا جاتا ہے۔ یہاں اس بات کی داد نہ دینا میں ظلم سمجھتا ہوں کہ جس تلخ صاف گوئی سے میں نے اپنے خطبہ میں کام لیا اسے وہاں نہایت ٹھنڈے دل سے سنا گیا اور بہتوں نے صداقت کا اعتراف بھی کیا۔ کالج کے پرنسپل ایک ایسے صاحب تھے جو موجودہ زمانہ کے "ترقی پسندوں" کی صفِ اوّل میں ہیں۔ میرے نقطۂ نظر سے ان کو سخت اختلاف ہونا ہی چاہیے لیکن اپنی "ترقی پسندی" کے ایک کھلے دشمن کو دعوت دینے والے وہ خود ہی تھے، اور اس کی تلخ گفتاری کو بھی حسبِ زیادہ خندہ پیشانی کے ساتھ انھوں نے ہی سنا۔ اگرچہ ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ تلخ صداقتیں مجھے اُن دارالعلوموں میں بھی جاکر عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جہاں مسلمانوں کی نوخیز نسلوں کے ساتھ اس سے بدتر معاملہ ہو رہا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ سو ٹوں میں لاکھوں عیوب کے باوجود جتنے بڑے دل چھپے ہوئے ہیں، جُبّوں میں اتنے بڑے دل بھی نہیں ہیں۔ جو کچھ میں ایک کالج میں کہہ گیا اس کا بیسواں حصہ بھی کسی دارالعلوم میں اس سے بہت زیادہ ادب کے ساتھ دست بستہ عرض کر دوں تو جان کی امان نہیں پا سکتا۔]

فاضل اساتذہ، معزز حاضرین، اور عزیز طلبہ!

آپ کے اس جلسہ تقسیم اسناد (قدیم اصطلاح کے مطابق جلسہ دستاربندی) میں مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا جو موقع دیا گیا ہے اس کے لیے میں حقیقۃً بہت شکر گزار ہوں۔ حقیقۃً کا لفظ میں خصوصیت کے ساتھ اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ یہ شکر گزاری رسمی نہیں بلکہ حقیقی ہے، اور گہرے جذبۂ قدرشناسی پر مبنی ہے۔ جس نظامِ تعلیم کے تحت آپ کا یہ عالی شان ادارہ قائم ہے اور جس کے تحت تعلیم پا کر آپ کے کامیاب طلبہ سندِ فراغ حاصل کر رہے ہیں، میں اُس کا

سخت دشمن ہوں اور میری دشمنی کسی ایسے شخص سے چھپی ہوئی نہیں جو مجھے جانتا ہے۔ اس امر واقعی کے معلوم و معروف ہونے کے باوجود جب یہاں اس تقریب پر مجھے خطبہ عرض کرنے کے لیے مدعو کیا گیا تو فطری بات تھی کہ میرا دل ایسے لوگوں کے لیے قدر و اعتراف کے جذبے سے بھر جائے جو اپنے طریق کار کے دشمن کی باتیں سننے کے لیے بھی اپنے قلب میں کافی وسعت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ مجھے آپ کی اس مہربانی پر بھی شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ آپ نے مجھے عین اس وقت اپنی قوم کے ان نوجوانوں سے خطاب کرنے کا موقع دیا ہے جبکہ یہ آپ سے رخصت ہو کر ہماری طرف عملی زندگی کے میدان میں آنے والے ہیں ——— معزز سامعین! اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں تھوڑی دیر کے لیے آپ کی طرف سے رُخ پھیر کر اپنے ان عزیزوں سے مخاطب ہو جاؤں جو آج یہاں سے ڈگری لے رہے ہیں، کیونکہ وقت کم ہے اور

غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

عزیزانِ من! آپ نے یہاں اپنی زندگی کے بہت سے قیمتی سال صرف کر کے تعلیم حاصل کی ہے۔ بڑی امنگوں کے ساتھ آپ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جبکہ آپ کو اپنی محنتوں کا پھل ایک ڈگری کی صورت میں یہاں سے ملنے والا ہے۔ ایسے موقع پر جسے آپ اپنے نزدیک مبارک موقع سمجھتے ہوں گے، آپ کے جذبات کی نزاکت کا مجھے پورا احساس ہے، اور اسی لیے آپ کے سامنے اپنے خیالات کا صاف صاف اظہار کرتے ہوئے میرا دل دکھتا ہے۔ مگر میں آپ سے خیانت کروں گا اگر محض نمائشی طور پر آپ کے جذبات کی رعایت کر کے وہ بات آپ سے نہ کہوں جو میرے نزدیک حق ہے اور جس سے آپ کو آگاہ کرنا اس وقت، اور اسی وقت میں ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ اس وقت آپ اپنی زندگی کے ایک مرحلے کو گذر کر دوسرے مرحلے کی طرف جا رہے ہیں۔ دراصل میں آپ کی اس مادرِ تعلیمی کو ——— اور خصوصی طور پر اسی کو نہیں بلکہ ایسی تمام مادرانِ تعلیمی کو ——— درس گاہ کے بجائے قتل گاہ سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک آپ فی الواقع یہاں قتل کیے جاتے رہے ہیں، اور یہ ڈگریاں جو آپ کو ملنے والی ہیں، یہ دراصل موت کے صداقت نامے (Death certificate) ہیں جو قاتل کی طرف سے آپ کو اس وقت دیے جا رہے ہیں جبکہ وہ اپنی حد تک اس بات کا اطمینان کر چکا ہے کہ

اس نے آپ کی گردن کا تسمہ تک لگا رہنے نہیں دیا ہے۔ اب یہ آپ کی اپنی خوش قسمتی ہے کہ اس منضبط اور منظم قتل گاہ سے بھی جان سلامت لے کر نکل آئیں۔ میں یہاں اس صداقت نامۂ موت کے حصول پر آپ کو مبارکباد دینے نہیں آیا ہوں بلکہ آپ کا ہم قوم ہونے کی وجہ سے جو ہمدردی قدرتی طور پر میں آپ کے ساتھ رکھتا ہوں وہ مجھے یہاں کھینچ لائی ہے۔ میری مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے بھائی بندوں کا قتل عام ہو چکنے کے بعد لاشوں کے ڈھیر میں یہ ڈھونڈتا پھرتا ہو کہ کہاں کوئی سخت جان بسمل ابھی سانس لے رہا ہے۔

یقین جانیے، یہ بات میں مبالغہ کی راہ سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں، اخباری زبان میں "سنسنی" پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ فی الواقع اس نظام تعلیم کے متعلق میرا نقطۂ نظر یہی ہے۔ اور اگر میں آپ کو ذرا تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ میں کیوں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں، تو کیا عجب کہ آپ خود بھی مجھ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

شاید آپ میں سے ہر شخص اس بات کو جانتا ہو گا کہ اگر کوئی پودا ایک جگہ سے اکھاڑ کر کسی دوسری ایسی جگہ لگا دیا جائے جہاں کی زمین، آب و ہوا، موسم، ہر چیز اس کی طبیعت کے خلاف ہو، تو وہ وہاں کبھی جڑ نہ پکڑ سکے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مصنوعی طور پر اس کے لیے وہی حالات پیدا کر دیے جائیں جو اس کی قدرتی جائے پیدائش میں تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ لیبوریٹری کی مصنوعی زندگی ہر پودے کو تمام عمر کے لیے میسر نہیں آ سکتی۔ اس غیر معمولی صورت حال کو نظر انداز کر دینے کے بعد یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ کسی پودے کو اس کی اصلی جائے پیدائش سے اکھاڑنا اور ایک مختلف قسم کے ماحول میں لے جا کر لگا دینا درحقیقت اسے ہلاک کرنا ہے۔

اچھا، اب ذرا اس بدقسمت پودے کی حالت کا اندازہ کیجیے جو اپنی زمین میں سے اکھاڑا نہیں گیا ہے، ماحول سے نکالا بھی نہیں گیا، وہی زمین ہے، وہی آب و ہوا ہے، وہی موسم ہے جس میں وہ پیدا ہوا تھا، مگر سائنٹفک طریقوں سے خود اس کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دی گئی کہ وہیں اپنی ہی جائے پیدائش میں اس کی طبیعت اس زمین، اس آب و ہوا، اور اس موسم سے بے لگاؤ اور بے یگانہ ہو کر رہ گئی، اور وہ اس قابل نہ رہا کہ اس زمین میں اپنی جڑیں پھیلا سکے، اس ہوا اور اس پانی سے غذا حاصل کر سکے، اور اس موسم میں پھل پھول سکے۔ اس اندرونی تغیر کی وجہ سے

وہ بعینہٖ ایسا ہو گیا ہے جیسے کسی دوسری زمین کا پودا ہے اور اجنبی ماحول میں لا کر لگا دیا گیا ہے۔ اب وہ اس کا محتاج ہو گیا ہے کہ اس کے گرد مصنوعی فضا تیار کی جائے اور مصنوعی طور پر اس کی زندگی کا سامان کیا جائے۔ یہ لیبوریٹری کی زندگی اگر اسے بہم نہ پہنچے تو وہ جہاں پیدا ہوا ہے وہیں کھڑے کھڑے زمین چھوڑ دے گا اور مرجھا کر رہ جائے گا۔

پہلا فعل، یعنی ایک پودے کو اکھاڑ کر اجنبی ماحول میں جا لگانا چھوٹے درجہ کا ظلم ہے اور دوسرا فعل، یعنی ایک پودے کو ایسی جگہ، جہاں وہ پیدا ہوا ہی، اپنے ماحول سے اجنبی بنا دینا، اس سے عظیم تر ظلم ہے۔ اور جب ایک دو نہیں لاکھوں پودوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جا رہا ہو، اور اتنے کثیر التعداد پودوں کے لیے لیبوریٹری کی مصنوعی فضا بہم پہنچانا محال ہو، تو بے جا نہ ہوگا اگر اسے ظلم کے بجائے قتلِ عام کہا جائے۔

حقیقی صورتِ حال کا جو مطالعہ میں نے کیا ہے وہ مجھے بتاتا ہے کہ ان درگاہوں میں آپ کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے۔ آپ ہندوستان کی سرزمین میں مسلم سوسائٹی کے اندر پیدا ہوئے ہیں۔ یہ زمین، یہی تمدنی آب و ہوا، اور یہی تہذیبی ماحول ہے جس کی پیداوار آپ ہیں۔ آپ کے نشو و نما پانے اور پھل پھول لانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اسی زمین میں جڑیں پھیلائیں، اور اسی آب و ہوا سے زندگی کی طاقت حاصل کریں۔ اس ماحول سے آپ کو جتنی زیادہ مناسبت ہوگی اسی قدر زیادہ بالیدگی آپ کو نصیب ہوگی اور اسی قدر زیادہ اس چمن کی بہار میں آپ اضافہ کر سکیں گے مگر واقعہ کیا ہے؟ یہاں جو تعلیم اور تربیت آپ کو ملتی ہے، جو ذہنیت آپ کے اندر پیدا ہوتی ہے، جو خیالات، جذبات اور داعیات آپ کے اندر پرورش پاتے ہیں، جو عادات، اطوار اور خصائل آپ میں راسخ ہوتے ہیں، اور جس طرزِ فکر، رنگِ طبیعت اور طریقِ زندگی کے سانچے میں آپ ڈھالے جاتے ہیں، کیا وہ سب مل جل کر اس زمین، اس آب و ہوا اور اس موسم سے کوئی مناسبت بھی آپ کے اندر باقی رہنے دیتے ہیں؟ یہ زبان جو آپ بولتے ہیں، یہ لباس جو آپ پہنتے ہیں، یہ طرزِ زندگی جو آپ اختیار کرتے ہیں، یہ نظریات اور افکار جو آپ اس تعلیم سے حاصل کرتے ہیں، ان سب چیزوں کو آخر کونسا لگاؤ آپ کے ان کروڑوں بھائیوں کے ساتھ ہے جن کے درمیان آپ کا جینا اور مرنا ہے، اور اُس تمدن کے ساتھ ہے جو آپ کے چاروں طرف چھایا ہوا ہے؟ آپ کی شخصیت اس ماحول میں کس قدر بے گانہ، اور یہ ماحول آپ کی شخصیت کے لیے کتنا اجنبی ہے! کاش آپ کے اندر اتنی حس ہی باقی رہنے دی گئی ہوتی کہ آپ اس بیگانگی کو اور اس کی اذیت کو محسوس کر سکتے۔

آپ اتنا تو بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ خام اشیاء کو صنعت اور کاریگری سے تیار کرنے کا مدعا یہی ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے لیے کارآمد اور مفید بن سکیں۔ جو چیز اس طرح بنائی گئی ہو کہ اُس سے یہ مدعا حاصل نہ ہو سکے، وہ خود بھی ضائع ہوئی، اور اس پر کاریگری بھی فضول صرف کی گئی۔ کپڑے پر خیاطی کی قابلیت اسی لیے صرف کی جاتی ہے کہ وہ جسم پر راست آئے۔ یہ بات حاصل نہ ہوئی تو اس کاریگری نے کپڑے کو بنایا نہیں، بگاڑ دیا۔ خام جنس پر طباخی کا فن صرف کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ کھانے کے قابل ہو جائے۔ اگر وہ کھانے ہی کے قابل نہ ہوئی تو باورچی نے اُسے ضائع کیا نہ کہ بنایا۔ بالکل اسی طرح تعلیم کا مدعا بھی یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں جن نئے انسانوں نے جنم لیا ہے، اور جن کی جبلی صلاحیتیں (Potentialities) ابھی خام حالت میں ہیں ان کو بنا سنوار کر اور بہتر طریقہ پر نشوونما دے کر اس قابل بنا دیا جائے کہ جس سوسائٹی نے انھیں جنم دیا ہے وہ اس کے مفید اور کارآمد فرد بن سکیں اور اس کی زندگی کے لیے بالیدگی اور فلاح و ترقی کا ذریعہ ہوں۔ مگر جو تعلیم افراد کو اپنی سوسائٹی اور اس کی حقیقی زندگی سے اجنبی بنادے اس کے حق میں اس کے سوا آپ اور کیا فتویٰ دے سکتے ہیں کہ وہ افراد کو بناتی نہیں بلکہ ضائع کرتی ہے؟ ہر قوم کے بچے دراصل اس کے مستقبل کا محضر ہوتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے یہ محضر ایک لوحِ سادہ کی شکل میں آتا ہے، اور قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ خود اس پر اپنے مستقبل کا فیصلہ لکھے۔ ہم وہ دیوانہ قوم ہیں جو اس محضر پر اپنے مستقبل کا فیصلہ خود لکھنے کے بجائے اسے دوسروں کے حوالہ کر دیتی ہے کہ وہ اس پر جو چاہیں ثبت کر دیں، خواہ وہ ہماری اپنی موت کا فتویٰ ہی کیوں نہ ہو۔

جب آپ کوئی کپڑا سلواتے ہیں اور وہ آپ کے جسم پر راست نہیں آتا تو مجبوراً آپ اسے مارکیٹ میں لے جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اونے پونے بیچ کر کچھ دام ہی سیدھے کر لیں۔ اگر کپڑا کوئی ذی شعور ہستی ہو تو وہ خود بھی اپنا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں سوچ سکتا کہ کہیں نہ کہیں اس کے سے ناپ اور اس کی سی تراش خراش کے کپڑے کی مانگ ہو تو وہ وہاں کھپ جائے۔ جب تک کسی جسم پر وہ راست نہ آئے گا، نیلام گھروں اور کباڑ خانوں میں مارا مارا پھرتا رہے گا۔ ایسا ہی حال ان لوگوں کا بھی ہے جو ان درسگاہوں سے تیار ہو کر نکلتے ہیں جس سوسائٹی

نے انھیں تیار کرایا ہے اس کے پاس جب یہ تیار ہو کر واپس پہنچتے ہیں، تو وہ بھی محسوس کرتی ہے اور یہ خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ اس کے تمدن اور اس کی زندگی کے لیے ٹھیک نہیں بنے جس طرح معدہ اس غذا کو قبول نہیں کرتا جو اس کے لیے مناسب نہ ہو، اسی طرح سوسائٹی بھی طبعی طور پر ان افراد کو اپنے اندر کھپا نہیں سکتی جو اس کے لیے مناسب نہ ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو اپنے کسی کام کا نہ پاکر نیلام کے لیے پیش کر دیتی ہے۔ جس قدر قیمت پر بھی یہ بک سکتے ہیں بیچ ڈالتی ہے۔ اور یہ خود بھی اپنی زندگی کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں سمجھتے کہ کہیں بک جائیں۔ آپ غور تو کیجیے کس قدر سخت خسارے میں ہے وہ قوم جو اپنی بہترین انسانی متاع دوسروں کے ہاتھ بیچتی ہے؟ ہم وہ ہیں جو انسان دے کر جوتی اور کپڑا اور روٹی حاصل کرتے ہیں! قدرت نے جو انسانی طاقت (Man-power) اور دماغی طاقت (Brain power) ہم کو خود ہمارے اپنے کام کے لیے دی تھی وہ دوسروں کے کام آتی ہے۔ ان ہٹے کٹے جسموں میں جو قوت بھری ہوئی ہے، ان بڑے بڑے سروں میں جو قابلیتیں بھری ہوئی ہیں، ان چوڑے چکلے سینوں میں جو دل طرح طرح کی طاقتیں رکھتے ہیں جنھیں خدا نے ہمارے لیے عطا کیا تھا، ان میں سے بمشکل ایک دو فی صدی ہمارے کام آتے ہیں، باقی سب کو دوسرے خرید لے جاتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ اس خسارے کی تجارت کو ہم بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا اصل سرمایۂ زندگی تو یہی انسانی طاقت ہے۔ اسے بیچنا نفع کا سودا نہیں بلکہ سراسر ٹوٹا ہے۔

مجھے بکثرت ایسے نوجوانوں سے ملنے کا موقع ملتا ہے جو اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں، یا تازہ تازہ فارغ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے میں یہ تحقیق کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنی زندگی کا کوئی مقصد بھی متعین کیا ہے یا نہیں۔ مگر میری مایوسی کی انتہا نہیں رہتی جب میں دیکھتا ہوں کہ مشکل سے ہزار میں کوئی ایک ایسا ملتا ہے جو اپنے سامنے زندگی کا کوئی مقصد رکھتا ہو۔ بلکہ بیشتر اصحاب تو ایسے ہیں جن کے ذہن میں اس امر کا سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے یا ہو سکتا ہے۔ مقصد کے سوال کو وہ محض ایک فلسفیانہ یا شاعرانہ مسئلہ سمجھتے ہیں، اور عملی حیثیت سے یہ طے کرنے کی کوئی ضرورت ان کو محسوس نہیں ہوتی کہ آخر دنیا کی زندگی میں ہماری کوششوں اور محنتوں کا اور ہماری تمام دوڑ دھوپ کا کوئی منتہا (Goal) اور کوئی مقصود بھی ہونا چاہیے

اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگتا ہے۔ میں حیران ہو کر سوچنے لگتا ہوں کہ اس نظامِ تعلیم کو کس نام سے یاد کروں جو پندرہ بیس سال کی مسلسل دماغی تربیت کے بعد بھی انسان کو اس قابل نہیں بناتا کہ وہ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کا کوئی مصرف اور اپنی کوششوں کا کوئی مقصود متعین کر سکے، بلکہ زندگی کے لیے کسی نصب العین کی ضرورت ہی محسوس کر سکے۔ یہ انسانیت کو بنانے والی تعلیم ہے یا اس کو قتل کرنے والی؟ بے مقصد (Aimless) زندگی بسر کرنا تو حیوانات کا کام ہے۔ اگر آدمی بھی صرف اس لیے جیے کہ جینا ہے، اور اپنی قوتوں کا مصرف بقائے نفس اور تناسل کے سوا کچھ نہ سمجھے تو آخر اس میں اور دوسرے حیوانات میں کیا فرق باقی رہا۔

میری اس تنقید کا یہ مدعا ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو ملامت کروں۔ ملامت تو قصوروار کو کی جاتی ہے۔ اور آپ قصوروار نہیں بلکہ مظلوم ہیں۔ اس لیے میں دراصل آپ کی ہمدردی میں یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب جو آپ زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھنے کے لیے جا رہے ہیں تو پوری طرح اپنا جائزہ لے کر دیکھ لیں کہ فی الواقع اس مرحلہ پر آپ کس پوزیشن میں ہیں۔ آپ ملتِ اسلام کے افراد ہیں۔ یہ ملت کوئی نسلی قومیت نہیں ہے کہ جو اس میں پیدا ہوا ہو وہ آپ سے آپ مسلم ہو، یہ محض ایک ایسے تمدنی گروہ (Cultural group) کا نام بھی نہیں ہے جس کے ساتھ محض معاشرتی حیثیت سے وابستہ ہونا مسلم ہونے کے لیے کافی ہو۔ دراصل اسلام ایک مخصوص نظامِ فکر (Ideology) کا نام ہے جس کی بنیاد پر تمدنی زندگی اپنے تمام شعبوں اور پہلوؤں کے ساتھ تعمیر ہوتی ہے۔ اس ملت کا بقا بالکل اس بات پر منحصر ہے کہ جو افراد اس میں شامل ہوں وہ اس نظامِ فکر کو سمجھتے ہوں، اس کی روح سے آشنا ہوں اور اپنی تمدنی زندگی کے ہر شعبہ میں اس روح کی عملی تفسیر و تعبیر پیش کرنے پر قادر ہوں۔ بالخصوص ملت کے اہلِ دماغ طبقہ (Intellingentsaia) کے لیے تو سب سے بڑھ کر اس علم و فہم اور اس عمل کی ضرورت ہے کیونکہ یہی طبقہ ملت کا رہنما اور پیش رو ہے۔ اگرچہ ہر قوم اور ہر گروہ کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کا اہلِ دماغ طبقہ اس کی مخصوص قومی تہذیب کے رنگ میں پوری طرح رنگا ہوا ہو، لیکن ملتِ اسلام کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ یہاں ہماری انفرادیت کی اساس نہ خاک ہے، نہ خون، نہ رنگ، نہ زبان، نہ

کوئی اور مادی چیز بلکہ صرف اسلام ہے۔ ہمارے زندہ رہنے اور ترقی کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہماری ملت کے افراد، اور خصوصاً اہل دماغ طبقے، اسلامی طرز فکر اور اسلامی طرز عمل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ اس لحاظ سے ان کی تعلیم اور تربیت میں جتنی اور جیسی کمزوری ہوگی اس کا عکس ہماری ملت کی زندگی میں جوں کا توں نمودار ہوگا۔ اور اگر وہ اس سے بالکل خالی ہوں تو یہ دراصل ہماری موت کا نشان ہوگا۔

یہ وہ حقیقت ہے جس سے یہاں کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ موجودہ نظام تعلیم میں ملت اسلام کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو انتظام کیا جاتا ہے وہ دراصل ان کو اس ملت کی پیشوائی کے لیے نہیں بلکہ اس کی غارت گری کے لیے تیار کرتا ہے؟ ان درسگاہوں میں آپ کو فلسفہ، سائنس، معاشیات، قانون، سیاسیات، تاریخ اور دوسرے تمام وہ علوم پڑھائے جاتے ہیں جن کی مارکیٹ میں مانگ ہے، مگر آپ کو اسلام کے فلسفے، اسلام کی اساس حکمت، اسلام کے اصول معیشت، اسلام کے اصول قانون، اسلام کے نظریہ سیاسی اور اسلام کی تاریخ اور فلسفہ تاریخ کی ہوا تک نہیں لگنے پاتی۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ آپ کے ذہن میں زندگی کا پورا نقشہ اپنے تمام جزئیات اور تمام پہلوؤں کے ساتھ بالکل غیر اسلامی خطوط پر بنتا ہے۔ آپ غیر اسلامی طرز پر سوچنے لگتے ہیں، غیر اسلامی نقطہ نظر سے زندگی کے ہر معاملہ کو دیکھتے ہیں اور دیکھنے پر مجبور ہوتے ہیں، کیونکہ اسلامی نقطہ نظر کبھی آپ کے سامنے آتا ہی نہیں۔ منتشر طریقہ پر کچھ معلومات اسلام کے متعلق آپ تک پہنچتی ہیں، مگر وہ غیر مستند اور بسا اوقات غلط اوہام و خرافات کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہیں۔ ان معلومات سے اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ آپ ذہنی طور پر اسلام سے اور زیادہ بعید ہو جاتے ہیں۔ آپ میں سے جو لوگ محض آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے اسلام کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے ہیں وہ دماغی طور پر غیر مسلم ہو جانے کے باوجود کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھاتے رہتے ہیں کہ اسلام حق تو ضرور ہوگا، اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور جو لوگ اس عقیدت سے بھی خالی ہو چکے ہیں وہ اسلام پر اعتراض کرنے اور اس کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتے۔

اس قسم کی تعلیم پانے کے ساتھ عملاً جو تربیت آپ کو میسر آتی ہے، جس ماحول میں آپ گھرے رہتے ہیں، اور عملی زندگی کے جن نمونوں سے آپ کو واسطہ پیش آتا ہے، اُن میں مشکل ہی سے کہیں اسلامی کیرکٹر اور اسلامی

طرزِ عمل کا نشان پایا جاتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کو نہ علمی حیثیت سے اسلام کی واقفیت بہم پہنچائی گئی ہو، نہ عملی حیثیت سے اسلامی تربیت دی گئی ہو، وہ فرشتے تو نہیں ہیں کہ خود بخود مسلمان بن کر اٹھیں۔ ان پر وحی تو نازل نہیں ہوتی کہ خود بخود ان کے دل میں علمِ دین ڈال دیا جائے۔ وہ پانی اور ہوا سے تو اسلامی تربیت اخذ نہیں کر سکتے۔ اگر وہ فکر اور عمل دونوں حیثیتوں سے غیر اسلامی شان رکھتے ہیں، تو یہ اُن کا قصور نہیں بلکہ ان درسگاہوں کا قصور ہے جو موجودہ نظامِ تعلیم کے ماتحت قائم کی گئی ہیں۔ درحقیقت یہ میرا وجدان ہے، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، کہ ان درسگاہوں میں دراصل آپ کو ذبح کیا جاتا ہے، اور اُس ملت کی قبر کھودی جاتی ہے جس کے نونہال آپ ہیں۔ آپ نے جس سوسائٹی میں جنم لیا، جس کے خرچ پر تعلیم پائی، جس کی فلاح کے ساتھ آپ کی فلاح اور جس کی زندگی کے ساتھ آپ کی زندگی وابستہ ہے، اس کے لیے آپ بے کار بنا کر رکھ دیے گئے ہیں۔ آپ کو صرف یہی نہیں کہ اس کی فلاح کے لیے کام کرنے کے قابل نہیں بنایا گیا، بلکہ دراصل آپ کو باضابطہ اور منظم طریقہ پر ایسا بنا دیا گیا ہے کہ بلا ارادہ آپ کی ہر حرکت اس ملت کے لیے فتنہ ساماں ہو، حتیٰ کہ آپ اس کی خیر خواہی کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیں تو وہ اس کے حق میں مضر ثابت ہو، اس لیے کہ آپ اس کی فطرت سے بیگانہ اور اس کے ابتدائی اصولوں تک سے بیگانہ رکھے گئے ہیں اور آپ کی پوری دماغی تربیت اُس نقشہ پر کی گئی ہے جو ملتِ اسلام کے نقشہ کے بالکل برعکس ہے۔

اپنی اس پوزیشن کو اگر آپ سمجھ لیں، اور اگر آپ کو پوری طرح احساس ہو جائے کہ فی الواقع کس قدر خطرناک حالت کو پہنچا کر اب آپ کو کار زارِ زندگی کی طرف جانے کے لیے چھوڑا جا رہا ہے، تو مجھے یقین ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ تلافی مافات کی کوشش ضرور کریں گے۔ پوری تلافی تو شاید اب بہت ہی مشکل ہے، تاہم میں آپ کو تین باتوں کا مشورہ دوں گا جن سے آپ کافی فائدہ اٹھا سکتے ہیں:

(۱) جہاں تک ممکن ہو عربی زبان سیکھنے کی کوشش کیجیے، کیونکہ اسلام کا ماخذِ اصلی، یعنی قرآن اسی زبان میں ہے، اور اُس کو جب تک آپ اس کی اپنی زبان میں نہ پڑھیں گے اسلام کا نظامِ فکر کبھی آپ کی سمجھ میں پوری

طرح نہ آسکے گا۔ عربی زبان کی تعلیم کا پرانا ہولناک طریقہ اب غیر ضروری ہوگیا ہے۔ جدید طرز تعلیم سے آپ چھ مہینے میں اتنی عربی سیکھ سکتے ہیں کہ قرآن کی عبارت سمجھنے لگیں۔

(۲) قرآن مجید، سیرت رسول اور صحابۂ کرام کی زندگی کا مطالعہ اسلام کو سمجھنے کیلئے ناگزیر ہے۔ جہاں آپ نے اپنی زندگی کے ۱۲-۱۵ سال دوسری چیزوں کے پڑھنے میں ضائع کیے ہیں، وہاں اس سے آدھا بلکہ چوتھائی وقت ہی اس چیز کے سمجھنے میں صرف کر دیجیے جس پر آپ کی ملت کی اساس قائم ہے، اور جس کو جانے بغیر آپ اس ملت کے کسی کام نہیں آسکتے۔

(۳) جو کچھ بھلی یا بری رائے آپ نے ناکافی اور منتشر معلومات کی بنا پر اسلام کے متعلق قائم کر رکھی ہو، اُس سے اپنے ذہن کو خالی کر کے اس کا باقاعدہ مطالعہ (Systematic study) کیجیے، پھر جس رائے پر بھی آپ پہنچیں گے وہ قابل وقعت ہوگی۔ تعلیم یافتہ آدمیوں کے لیے یہ کسی طرح موزوں نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کے متعلق کافی معلومات حاصل کیے بغیر رائے قائم کریں۔

اب میں اس دعا کے ساتھ اپنا یہ خطبہ ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے اور آپ کو اس خطرے سے بچالے جس میں آپ پھنسا دیے گئے ہیں۔

رسائل و مسائل

ڈارون کا نظریۂ ارتقاء

"ڈارون کا نظریۂ ارتقاء موجودہ زمانہ کے علمی مسلمات میں سے ہے، مگر قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں قطعی تضاد ہے۔ سب سے زیادہ صریح بات جو یک نظر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا انسان اول روز سے انسان ہی تھا جسے ایک خاص تاریخ کو یکایک ایک تخلیقی عمل سے پیدا کر دیا گیا، پھر اس سے انسانی نسل چلی لیکن ہم کو جو طبعی علوم پڑھائے جاتے ہیں وہ شہادت دیتے ہیں کہ انسان حیوانات میں سے بتدریج ترقی کرتا ہوا آیا ہے اور اس ارتقائی تسلسل میں کسی نقطہ پر انگلی رکھ کر نہیں کہا جا سکتا کہ ایک خاص تاریخ کو اس مرحلہ پر حیوانیت ختم ہوئی اور انسانیت کی ابتدا ہوئی جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ فَاِذَا نَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ۔ یہ قرآن اور نظریۂ ارتقاء کے اختلاف کی صرف ایک صریح مثال ہے، ورنہ تخلیق کے مسئلے میں بکثرت تفصیلات ایسی ہیں جہاں ان دونوں کے بیانات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر موجودہ سائنس کا ایک طالب علم اپنے ایمان کو محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ کیا آپ اس مشکل کا کوئی حل بتا سکتے ہیں؟"

آپ نے جو سوال کیا ہے، خط و کتابت اس کے جواب کی کہاں متحمل ہو سکتی ہے۔ ایک نظریہ جو بڑے دلائل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور موجودہ دور کے تمام بڑے بڑے علوم میں سرایت کر چکا ہے، اس کا تنقیدی مطالعہ اور قرآن کے بیانات سے اس کا تقابل ایک مستقل تحقیقی بحث چاہتا ہے جس کے لیے ایک مضمون میں بھی گنجائش نہیں نکل سکتی کجا کہ ایک مختصر خط میں۔ تاہم آپ کے اطمینان کے لیے چند اشارات کیے دیتا ہوں۔

پہلی بات یہ سمجھ لیجیے کہ ڈارون کا نظریہ جس طرح ابتدا میں صرف ایک نظریہ تھا اسی طرح آج تک نظریہ (Theory) ہی ہے، واقعہ (Fact) ابھی تک ثابت نہیں ہو سکا ہے۔ نظریہ اور واقعہ کا فرق آپ جیسے تعلیم یافتہ آدمی سے پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بھی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آدمی کے لیے اپنے ایمان پر نظرِ ثانی کرنے کا سوال صرف اُسی صورت میں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ چیز جس پر وہ ایمان رکھتا ہے کسی ایسی چیز سے ٹکرائے جو ثابت شدہ واقعہ ہو۔ قیاسات و نظریات کی ٹکر بھی جو ایمان نہ سہ سکے وہ کسی کام کا ایمان نہیں، خصوصاً جبکہ ان "علمی" قیاسات کی ساری تاریخ شاہد ہے کہ یہ بیچارے خود ایک صدی کے علمی تغیرات کی ٹکر بھی مشکل ہی سے سہ سکے ہیں۔

علم الحیات (Biology) کے جس مشکل ترین مسئلہ میں سائنس کے علما الجھ رہے ہیں وہ دراصل یہ سوال ہے کہ زندگی کا مبدا کیا ہے۔ قرآن اس کا جواب دیتا ہے کہ زندگی کا مبدا خدا کا حکم (امرِ رب) ہے۔ وہ صرف خدا کا حکم ہی ہے جو بے جان مادے میں آثارِ حیات پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن موجودہ سائنس جن لوگوں کے ہاتھوں نشوونما پا رہا ہے وہ اس کارخانۂ ہستی میں کسی فوق الفطرت ذات (Super natural) کی کارفرمائی و کاریگری ماننے اور محسوس کرنے سے ہر ممکن طور پر پہلو بچانا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش یہ ہے کہ اسی کارگاہِ فطرت میں انھیں اس کی کارفرما طاقت کا بھی کہیں سراغ مل جائے۔ یہی بنیادی غلطی ان کے لیے وہ مشکل سوالات پیدا کرتی ہے جنھیں حل کرنے کے لیے وہ قیاس آرائیاں کرتے ہیں اور پھر اسی قیاس آرائی کا سلسلہ انھیں کائنات کے تنوع اور ان کے تفاضل کی توجیہ تک دراز ہوتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ فی الواقع علمی ذوق رکھنے والے ہیں وہ تو قیاس کو قیاس ہی کی حد تک رکھتے ہیں، لیکن جو کم تر درجہ کے لوگ ہیں (جن کو میں "علمی کم ظرف" اور دنیائے علم کا "نودولتا" سمجھتا ہوں) ان کا حال یہ ہے کہ قیاسات و نظریات کو اس شان سے بیان کرتے ہیں گویا وہ حقائق ہیں جو علمی طور پر ثابت ہو چکے ہیں۔ اسی سے سائنس کے مبتدیوں کو غلط فہمیاں لاحق ہوتی ہیں۔

ڈارون نے جب تحقیق و تجسس کا آغاز کیا اس وقت اگر وہ قرآن کے دیے ہوئے نقطۂ آغاز (Starting point) سے چلتا تو اس نتیجہ پر پہنچتا کہ زندگی کی شکلوں میں یہ تنوع اور تفاضل جو ایک بے نظیر ترتیب کے ساتھ واحد الخلیہ

بھنگے (Unicellular molecule) سے لے کر انسان تک نظر آ رہا ہے، یہ ایک حکیم کے منصوبے (Design) کا نتیجہ ہے جو مختلف انواع کی زندگی کے لیے مناسب ماحول اور ساز گار حالات فراہم کرنے کے بعد اُنھیں ان کی مخصوص نوعی خصوصیات کے ساتھ بتدریج وجود میں لاتا چلا گیا ہے اور جن انواع کی ضرورت اس کے خاکے میں باقی نہیں رہی ہے انھیں مٹاتا بھی رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ لوگ منصوبہ ساز (Designer) کو ماننے سے جی چراتے ہیں اور اس کی کارگاہ میں اس کی کارفرمائی کے نشانات دیکھنا نہیں چاہتے اس لیے جو شہوات ان کے مشاہدے میں آتے ہیں ان کی توجیہ یہ کسی ایسے طریقہ سے کرنا چاہتے ہیں جس سے یہ کارخانہ خود بخود چلتا اور ترقی کرتا ہوا سمجھا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈارون نے تنوع اور تفاضل کی توجیہ ارتقاء کے اُس نظریہ سے کی جو اس کے نام سے مشہور ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یورپ نے جو اس وقت تک اپنے الحاد کو پاؤں کے بغیر چلا رہا تھا، لپک کر یہ لکڑی کے پاؤں ہاتھوں ہاتھ لیے اور نہ صرف اپنے سائنس کے تمام شعبوں میں، بلکہ اپنے فلسفہ اخلاق اور اپنے علوم عمران تک میں اُن کو نیچے سے فٹ کر لیا۔ حالانکہ علمی اور عقلی حیثیت سے اِس کی توجیہ میں اتنے جھول ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی صاف دماغ کا آدمی اس کو منطقی ممکن توجیہات میں ایک قابل لحاظ توجیہ قرار دے سکتا ہے۔

پیچیدہ اور گہری علمی تنقید سے بچتے ہوئے میں آپ کو ایک مثال سے ڈاروینی نظریہ ارتقاء کا اصلی و بنیادی ضعف سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ فرض کیجیے کہ مریخ سے سائنس کا ایک پروفیسر اپنے کچھ شاگردوں کے ساتھ علمی تحقیقات کے لیے زمین پر آتا ہے اور ان لوگوں کی بینائی میں کوئی ایسی کمزوری ہے جس کی وجہ سے وہ یہاں انسان کو نہیں دیکھ سکتے البتہ انسان کی مصنوعات اور اس کے تمدن کے آلات و وسائل کو بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ محقق پروفیسر یہاں انسان کی جو صنعتیں دیکھتا ہے ان میں اسے شکلوں اور نوعیتوں کا فرق بھی نظر آتا ہے، ان میں سے بعض کو وہ بعض سے بہتر بھی پاتا ہے۔ دورانِ تحقیق میں اس کو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض چیزیں پہلے رائج نہ تھیں، بعد میں رائج ہوئیں، بعض قدیم سے رائج رہی ہیں اور اب تک رائج چلی آ رہی ہیں، اور بعض پہلے رائج تھیں مگر اب مفقود ہیں۔ کچھ زمانہ تک وہ اس بکھرے ہوئے منظر کی اشیاء کو اپنے ذہن میں مرتب کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ مختلف قسم کی اشیاء کو انواع اور اصناف میں تقسیم کر کے

ان کے درجات قائم کرلیتا ہے۔ اس کے بعد وہ تحقیق کا قدم آگے بڑھاتا ہے اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آخر یہ تنوع اور تفاضل اشیا نہیں کیسے، اور ان کے تنوع اور تفاضل میں اور بعض کے باقی اور بعض کے معدوم ہو جانے میں کیا اسباب اور کیا قوانین کارفرما ہیں۔ اس سوال کا ایک جواب اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ یہاں غالباً ایسی اور ایسی صفات کی کوئی ہستی موجود ہے جو ان چیزوں کو اپنی مختلف مصلحتوں کے لحاظ سے بناتی ہے، جن چیزوں کی ضرورت باقی ہے انھیں بنائے چلی جاتی ہے، جن کی ضرورت باقی نہیں رہی انھیں بنانا چھوڑ چکی ہے، اور جن کی ضرورت اب کسی دوسری شکل کی چیز سے بہتر طور پر پوری ہونے لگی ہے انھیں بنانا چھوڑتی جارہی ہے۔ لیکن کسی وجہ سے یہ تاریخی محقق کسی ایسی ہستی کو فرض کرنے سے بچنا چاہتا ہے اس لیے وہ قیاس کا رُخ دوسری طرف پھیر کر اپنے منظر کی توجیہ اس طرح شروع کر دیتا ہے کہ ان تمام مصنوعات کی ابتدا غالباً صنعت کے ایک ہی ابتدائی بیج سے ہوئی تھی، پھر اس میں ارتقا شروع ہوا اور ماحول کے فلاں فلاں اسباب سے ان اشیا کی مختلف انواع وجود میں آئیں، پھر ان انواع نے ایک دوسرے کے خلاف کشمکش شروع کی اور ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنے ماحول سے اپنے آپ کو موافق کرنے اور ماحولی طاقتوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کشمکش میں جو مصنوعات ناکام رہ گئیں وہ مٹ گئیں اور جو کامیاب ہوئیں انھیں ماحول نے بقا کے لیے چن لیا۔ یہی کشمکش ان مصنوعات کی شکلوں اور صفتوں کے ارتقا کی موجب ہوئی اور بقا کی جدوجہد ہی میں ایک نوع کی چیزیں ترقی کرتے کرتے دوسری نوع کی مصنوعات میں تبدیل ہوتی چلی گئیں، مثلاً چھکڑے کی نوع مدتوں تک زور لگاتی رہی یہاں تک کہ اس کے بعض قابل تر افراد کی ترکیب میں تغیرات رونما ہونے چلے گئے اور بالآخر وہ بگھی میں تبدیل ہوگئے۔ پھر بگھی کی نوع نے زور لگانا شروع کیا حتیٰ کہ اس کے بعض قابل افراد کی ترکیب میں پھر تغیر ہونے لگا اور بالآخر وہ موٹر میں تبدیل ہوگئے۔ پھر بعض موٹروں نے اونچے اونچے درختوں اور مکانوں اور عمارتوں کو دیکھ کر ان کے اوپر پہنچنا چاہا اور اس کوشش میں اُچکنا شروع کیا یہاں تک کہ اچکتے اچکتے ان کے پر نکل آئے اور بالآخر وہ ہوائی جہاز میں تبدیل ہوگئیں۔ اس محقق جلیل نے ساتھ مریخ کے سائنس کالج سے جو طالب علم آئے تھے وہ عرض کرتے ہیں کہ قبلہ، چھکڑے سے بگھی اور بگھی سے موٹر اور موٹر سے ہوائی جہاز تک بتدریج جو ارتقا ہوا ہوگا تو لازماً چھکڑے اور بگھی کے

درمیان، اور گمھی اور موٹر کے درمیان، اور موٹرا اور ہوائی جہاز کے درمیان بکثرت ایسی کڑیاں پائی جانی چاہییں جو ان میں سے ہر دو نوعوں کے بیچ کا فاصلہ ابھی طے کر رہی ہوں، اور اس فاصلہ میں ہر ہر قدم پر ان درمیانی کڑیوں کے مختلف افراد ایک قافلے کی طرح آگے پیچھے چلتے نظر آنے چاہییں۔ مثلاً گمھی اور موٹر کے درمیانی فاصلے میں بہت سی ایسی اقسام کی گاڑیاں ملنی چاہییں جو ابھی کچھ گمھی ہوں اور کچھ موٹر ہونے کے مختلف درجوں میں ہوں، اور اسی طرح موٹر اور ہوائی جہاز کے درمیان ایسی بہت سی اقسام کی سواریاں پائی جانی چاہییں جو ابھی پر نکال رہی ہوں۔ اس سوال کو سن کر پروفیسر صاحب کچھ دیر سوچتے ہیں، پھر کہتے ہیں کہ ہاں، یہ درمیانی کڑیاں ضرور پائی جاتی ہوں گی، گمھی سے "گمھ موٹرا" بنا ہوگا، پھر وہ "موٹر گمھے" میں تبدیل ہوا ہوگا، پھر اس نے "موٹر گمھ" کی شکل اختیار کی ہوگی، پھر وہ موٹر میں تبدیل ہو گیا جسے تم دیکھ ہی رہے ہو، پھر موٹر اپنی ارتقائی جدوجہد سے "پنکھ موٹرا" بنی ہوگی، پھر وہ "موٹر پنکھ" میں تبدیل ہوئی ہوگی، پھر "موٹر پنکھا" پیدا ہوا ہوگا، پھر وہی تبدیل ہو کر یہ ہوائی جہاز بن گیا جو تمہارے سامنے موجود ہے۔ یہ بیچ کی کڑیاں جن کے نام میں نے لیے ہیں ضرور کہیں نہ کہیں پائی جاتی ہوں گی، جاؤ اور مٹی کے ڈھیروں میں انھیں تلاش کرو۔ استاد تو یہ کہکر خاموش ہو گیا، مگر شاگرد جو مریخ ہی سے انسان کے خلاف ایک تعصب دل میں لیے ہوئے آئے تھے، اس کی اس نادر تحقیق پر ایسا ایمان لائے کہ انھوں نے استاد کے کلام میں سے "غالباً" اور "ہوا ہوگا" کو بھی نکال دیا اور اب وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس کو "یقیناً" اور "ہے" کے ساتھ بیان کرنے لگے ہیں۔ ان کے علمی لکچروں میں "موٹر گمھا" اور "پنکھ موٹرا" وغیرہ خیالی موجودات کا ذکر اس طرح آتا ہے گویا کہ یہ چیزیں کہیں ان کے میوزیم میں موجود ہیں۔

ڈارون کے نظریہ اور ڈارونیت کے متبعین پر یہ تمثیل بالکل ٹھیک ٹھیک راست آتی ہے۔ اس نظریہ کے اصل لٹریچر کو آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کی ساری بنیاد "ہوگا" پر ہے، حالانکہ سائنس میں اصل قابل اعتبار چیز "ہے" نہ کہ "ہوگا"۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر سائنس میں "ہوگا" بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے تو "ایک ہوگا" اور "دوسرے ہوگا" میں فرق کیوں ہو۔ خصوصاً جبکہ ایک "ہوگا" دوسرے "ہوگا" سے کچھ زیادہ ہی لگتا ہوا ہو۔ جب آپ اس کے لیے تیار ہیں کہ شہادات کی توجیہ میں "ہوگا" کو بھی مان لیں تو ڈارون کے "ہوگا" سے میرا یہ "ہوگا" کچھ زیادہ

ہی لگتا ہوا ہے کہ زندگی کا آغاز اور زندہ اشیاء کا تنوع اور ان کا تفاضل سب کا سب ایک حکیم کے امر اور حکیمانہ تدبر سے ہے۔ میرا "یہ ہوگا" ڈارون کے "ہوگا" سے زیادہ بہتر طریقہ پر تمام شہودات کی توجیہ کرتا ہے، کسی سوال کو لاجواب نہیں چھوڑتا، اور سب سے بڑھ کر اس کے حق میں وجہ ترجیح یہ ہے کہ اس طرف تو کوئی آدمی صداقت کے ساتھ "ہوگا" سے زیادہ کچھ کہنے کے قابل نہیں ہے مگر اس طرف کثرت صالح ترین انسان، جو کبھی جھوٹ بولتے نہیں پائے گئے، پورے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ "ہے" اور ہم آنکھوں دیکھی بات کہہ رہے ہیں کہ "ہے"۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سائنس کے طالب علم ادھر آنے کے بجائے ادھر جا رہے ہیں؟ کیا اس کی کوئی وجہ اس خدا بیزاری (Theopholia) کے سوا ہے جو قرون متوسطہ سے سائنس کے طالب علموں کو میراث میں ملی ہے؟ اگر یہی بات ہے تو "جذبات" کا نام لوگوں نے "علم" کیوں رکھ چھوڑا ہے۔

علمی اور عقلی حیثیت سے اس نظریہ میں جو کمزوریاں ہیں ان سے قطع نظر کرکے اگر دیکھا جائے کہ فلسفے اور اخلاق اور علوم تمدن و اجتماع میں داخل ہو کر اس ظالم تخیل نے انسان کو برباد کرنے کے لیے کیسے شدید فتنے برپا کیے ہیں، تو شاید کسی صاحب بصیرت آدمی کو یہ ماننے میں ذرہ برابر تامل نہ ہوگا کہ موجودہ دور میں جن نظریات نے انسان کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کی ہے، یہ ڈاروینیت ان سب کی سرتاج ہے۔ اگر انسان کی فلاح چاہنے والوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو تو وہ اس نظریے کی تعلیم دینے والوں کے ساتھ اس سے زیادہ سخت برتاؤ کریں جو انارکی پھیلانے کے لیے بم سازی اور ڈاکہ زنی کی تعلیم و تبلیغ کرنے والوں سے کیا جاتا ہے۔

نواقضِ وضو

"اسلام نے جسم و لباس کی طہارت و نظافت کا جو لحاظ رکھا ہے اس کی قدر و قیمت سے عقلِ انسانی انکار نہیں کر سکتی۔ لیکن اس سلسلہ میں بعض جزئیات بالکل ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ریح کے نکلنے سے وضو کا ٹوٹ جانا، حالانکہ جسم کے ایک حصہ سے محض ایک ہوا کے نکل جانے میں بظاہر

کوئی ایسی نجاست نہیں ہے جس سے وضو ساقط ہو جائے۔ آخر اس ہوا سے کیا چیز گندی ہو جاتی ہے؟ اسی طرح پیشاب کرنے سے وضو کا سقوط، حالانکہ اگر احتیاط سے پیشاب کیا جائے اور پھر اچھی طرح دھو لیا جائے تو کہیں کوئی نجاست لگی نہیں رہ جاتی۔ یہی حال دوسرے نواقض وضو کا ہے جن سے وضو ٹوٹنے اور تجدید وضو لازم آنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ براہ کرم اس الجھن کو اس طرح دور کیجیے کہ مجھے عقلی اطمینان حاصل ہو جائے۔"

نواقض وضو کے مسئلے میں آپ کو جو شبہات پیش آئے ہیں انھیں اگر آپ حل کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ شریعت میں جن جن باتوں سے وضو کے ٹوٹنے اور تجدید وضو لازم آنے کا حکم لگایا گیا ہے پہلے ان سب کو اپنے ذہن سے نکال دیجیے، پھر خود اپنے طور پر سوچیے کہ عام انسانوں کے لیے (جن میں عالم اور جاہل، عاقل اور کم عقل، طہارت پسند اور طہارت سے غفلت کرنے والے، سب ہی قسم کے لوگ مختلف درجات و حالات کے موجود ہوں) آپ کو ایک ایسا ضابطہ بنانا ہے جس میں حسب ذیل خصوصیات موجود ہوں:

(۱) لوگوں کو بار بار صاف اور پاک ہوتے رہنے پر مجبور کیا جائے اور ان میں نظافت کی حس اس قدر بیدار کر دی جائے کہ وہ نجاستوں اور کثافتوں سے خود بچنے لگیں۔

(۲) خدا کے سامنے حاضر ہونے کی اہمیت اور امتیازی حیثیت ذہن میں بٹھائی جائے تاکہ نیم شعوری طور پر آدمی خود بخود اپنے اندر یہ محسوس کرنے لگے کہ نماز کے قابل ہونے کی حالت دنیا کی دوسری مشغولیتوں کے قابل ہونے کی حالت سے لازماً مختلف ہے۔

(۳) لوگوں کو اپنے نفس اور اس کے حال کی طرف توجہ رکھنے کی عادت ڈالی جائے تاکہ وہ اپنے پاک یا ناپاک ہونے، اور ایسے ہی دوسرے احوال سے جو ان پر وارد ہوتے رہتے ہیں، بے خبر نہ ہونے پائیں اور ایک طرح سے خود اپنے وجود کا جائزہ لیتے رہیں۔

(۴) ضابطہ کی تفصیلات کو ہر شخص کے اپنے فیصلہ اور رائے پر نہ چھوڑا جائے بلکہ ایک طریق کار

معین ہو تاکہ انفرادی طور پر لوگ طہارت میں افراط و تفریط نہ کریں۔

(۵) ضابطہ اس طرح بنایا جائے کہ اس میں اعتدال کے ساتھ طہارت کا مقصد حاصل ہو۔ نہ اتنی سختی ہو کہ زندگی تنگ ہو کر رہ جائے اور نہ اتنی نرمی کہ پاکیزگی ہی باقی نہ رہے۔

ان پانچ خصوصیات کو پیش نظر رکھ کر آپ خود ایک ضابطہ تجویز کریں اور خیال رکھیں کہ اس میں کوئی بات اُس نوعیت کی نہ آنے پائے جس پر وہ اعتراضات ہو سکتے ہوں جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔ اس قسم کا ضابطہ بنانے کی کوشش میں اگر آپ صرف ایک ہفتہ صرف کریں گے تو آپ کی سمجھ میں خود بخود یہ بات آ جائیگی کہ ان خصوصیات کو ملحوظ رکھ کر صفائی و طہارت کا کوئی ایسا ضابطہ نہیں بنایا جا سکتا جس پر اُس نوعیت کے اعتراضات وارد نہ ہو سکتے ہوں جو آپ نے پیش کیے ہیں۔ آپ کو بہر حال کچھ چیزیں ایسی مقرر کرنی پڑیں گی جن کے پیش آنے پر ایک طہارت کو ختم شدہ فرض کرنا اور دوسری طہارت کو ضروری قرار دینا ہو گا۔ آپ کو یہ بھی متعین کرنا ہو گا کہ ایک طہارت کی مدتِ قیام (Duration) کن حدود تک رہے گی اور کن حدود پر ختم ہو جائے گی۔ اس غرض کے لیے جو حدیں بھی آپ تجویز کریں گے ان میں ناپاکی ظاہر اور نمایاں اور محسوس نہ ہو گی بلکہ فرضی اور حکمی ہی ہو گی اور لا محالہ بعض حوادث ہی کو حد بندی کے لیے نشان مقرر کرنا ہو گا۔ پھر آپ خود غور کیجیے کہ آپ کی تجویز کردہ حدیں ان اعتراضات سے کس طرح بچ سکتی ہیں جو آپ نے تحریر فرمائے ہیں۔

جب آپ اس زاویہ نظر سے اس مسئلہ پر غور کریں گے تو آپ خود بخود اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ شارع نے جو ضابطہ تجویز کر دیا ہے وہی ان اغراض کے لیے بہترین اور غایت درجہ معتدل ہے۔ اس کے ایک ایک جزئیہ کو الگ الگ لے کر علت و معلول اور سبب و مسبب کا ربط تلاش کرنا معقول طریقہ نہیں ہے بلکہ صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا بحیثیت مجموعی ان اغراض و مصالح کے لیے جو اوپر بیان ہوئی ہیں، اس سے بہتر اور جامع تر کوئی ضابطہ تجویز کیا جا سکتا ہے؟ لوگوں کو احکام وضو میں جو غلط فہمی پیش آتی ہے اس کی

اصل وجہ یہی ہے کہ وہ اس بنیادی حکمت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جو بحیثیت مجموعی ان احکام میں ملحوظ رکھی گئی ہے بلکہ ایک ایک جزئی حکم کے متعلق یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں فعل میں آخر کیا بات ہے کہ اس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی ضد آخر کس طرح شکستِ وضو کا سبب بن جاتی ہے۔

آلات کے ذریعہ توالد و تناسل

"کیمیاوی آلات کے ذریعہ سے اگر مرد کا نطفہ کسی عورت کے رحم میں پہنچا دیا جائے اور اس سے اولاد پیدا ہو، تو یہ عمل مضرت سے خالی ہونے کی وجہ سے مباح ہے یا نہیں؟ اور اس عمل کی معمولہ زانیہ شمار کی جائے گی اور اس پر حد جاری ہوگی یا نہیں؟ اس امر کا خیال رکھیے کہ آج کل کی فیشن دار عورت مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے۔ وہ اگر سائنٹفک طریقوں سے اپنے حصہ کا نسل بڑھانے کا فریضہ ادا کرلے تو پھر اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ امریکہ میں اس طرح پیدا ہونے والی اولاد کو از روئے قانون جائز اولاد تسلیم کیا گیا ہے۔"

آلات کے ذریعہ استقرارِ حمل کا جواز تو دور رہا، میرے لیے اس عمل کا تصور ہی ناقابلِ برداشت ہے کہ عورت گھوڑی کے مرتبے تک گرا دی جائے۔ آخر انسان کی صنفِ اناث اور حیوانات کی مادہ میں کچھ تو فرق رہنے دیجیے۔ حیوانات میں بھی اللہ تعالیٰ نے جو طریقہ توالد و تناسل کا مقرر کیا ہے وہ نر اور مادہ کے اجتماع کا طریقہ ہے۔ یہ انسان کی خود غرضی ہے کہ گھوڑیوں کو ان کے نروں سے ملنے کی لذت ان کو حاصل نہیں کرنے دیتا اور ان سے صرف نسل کشی کا کام لیتا ہے۔ اب اگر انسان خود اپنی مادہ سے بھی یہی برتاؤ کرے تو اس کے معنی انسانیت کی انتہائی تذلیل کے ہیں۔ آج کی "فیشن دار" عورت جو مرد سے بے نیاز ہونا چاہتی ہے، دراصل اس کی فطرت کو مصنوعی فکری و ثقافتی ماحول نے مسخ کر دیا ہے، ورنہ اگر وہ صحیح انسانی فطرت پر ہو تو اس قسم کی گری ہوئی خواہش کو دل میں جگہ دینا تو درکنار، ایسی تجویز سننا بھی گوارا نہ کرے۔ عورت محض نسل کشی کے لیے نہیں ہے بلکہ عورت اور مرد کا تعلق انسانی تمدن کی قدرتی بنیاد ہے۔ فطرتِ الٰہی نے عورت اور مرد کو اس لیے پیدا کیا ہے

کہ ان میں مودت ہو حسنِ معاشرت ہو مل کر گھر بنائیں، گھر سے خاندان اور خاندان سے سوسائیٹی نشو و نما حاصل کرے۔ اس مقصود کو ضائع کر کے عورت کو محض نسل کشی کا آلہ بنا دینا فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بدل دینے) کا مصداق ہے جسے قرآن ایک شیطانی فعل قرار دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا طریقہ مقرر فرمایا ہے۔ لہٰذا وہی اولاد جائز اولاد ہے جو قیدِ نکاح میں پیدا ہو۔ اسی سے وراثت اور نسب کی تحقیق ہوتی ہے۔ اگر آلہ کے ذریعہ سے بچہ پیدا کیا جائے تو اسے حلالی نہیں کہا جا سکتا۔ شرعی نقطۂ نظر سے وہ حرامی ہی کہا جائے گا۔ نیز اس کا سلسلۂ آبائی منقطع ہوگا اور وہ باپ کے ورثہ سے محروم رہے گا جو قطعی طور پر اس کی حق تلفی ہے۔

پھر غور تو کیجیے کہ جس بچے کا کوئی باپ نہ ہو اس کی تربیت کا ذمہ دار کون ہوگا؟ صرف ماں؟ کیا یہ ظلم نہیں کہ خدا نے انسان کے بچہ کے لیے ماں اور باپ چچا اور ماموں، دادا اور نانا وغیرہ لوگوں کی صورت میں جو مربی پیدا کیے ہیں ان میں سے آدھے ساقط کر دیے جائیں اور وہ صرف سلسلۂ مادری پر منحصر رہ جائے؟ کیا دنیا سے پدری محبت، پدرانہ ذمہ داریوں اور پدرانہ اخلاق کو فنا کر دینا انسانیت کی کوئی خدمت ہے؟ کیا یہ انصاف ہے کہ عورت پر ماں ہونے کی ذمہ داری تو قائم رہے مگر مرد ہمیشہ کے لیے اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے؟

پھر اگر یہی سلسلہ چل پڑا تو ایک روز عورت مطالبہ کرے گی کہ کوئی ترکیب ایسی ہونی چاہیے کہ انسان کا بچہ میرے رحم میں پرورش پانے کے بجائے "امتحانی نلیوں" میں پالا جائے۔ یعنی انسان کیمیاوی معمل میں پیدا ہونے لگے

آمد آں وقتے کہ از اعجازِ فن
می تواں دیدن جنین اندر بدن

پرورش گیرد جنیں نوعِ دگر
بے شبِ ارحام دریابد سحر

آنچہ از نیساں فرو ریزد نگیر
اے صدف! در زیرِ دریا تشنہ میر

(جاوید نامہ)

جب تک یہ حالت پیدا نہیں ہوتی عورت چاہے گی کہ مجھے صرف بچہ جننے کی تکلیف دی جائے، اس کے بعد ماں کے فرائض انجام دینے کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔ یہ صورت جب رونما ہوگی تو انسانی بچے اسی طرح "کثیر پیدا آوری" (   ) کے اصول پر فیکٹریوں میں ڈھل ڈھل کر نکلیں گے جس طرح اب جوتے اور موزے نکلتے ہیں۔ یہ انسانیت کے تنزل کا آخری مقام، اس کا اسفل السافلین ہوگا۔ ان "کارخانہ ہائے نسل کشی" سے انسان نہیں بلکہ دو ٹنگے جانور پیدا ہوں گے جن میں انسانی شرف کی خوبو برائے نام بھی نہ ہوگی اور سیرت کا وہ تنوع ناپید ہوگا جو تمدن کی رنگا رنگ ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ ان کارخانوں سے کسی ارسطو اور ابن سینا، کسی غزالی اور رازی، کسی ہیگل اور کانٹ کے پیدا ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ میرے خیال میں تو وہ مادہ پرستانہ تہذیب لعنت بھیجنے کے قابل ہے جس کے زیر سایہ ایسی تجویزیں انسان کے دماغ میں آتی ہیں۔ اس قسم کی تجویزوں کا انسانی دماغوں میں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس تہذیب نے انسان کے ذہن میں خود انسانیت کے تصور کو نہایت پست اور ذلیل کر دیا ہے۔

مشینی امامت

"ریڈیو ایک ایسا آلہ ہے، جو ایک شخص کی آواز کو سینکڑوں میل دور پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح گراموفون کے ریکارڈوں میں انسانی آواز کو محفوظ کر لیا جاتا ہے اور پھر اسی خاص طریقوں سے دہرایا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی امام ہزاروں میل کے فاصلے کو بذریعہ ریڈیو امامت کرائے یا کسی امام کی آواز کو گراموفون ریکارڈ میں منضبط کر لیا گیا ہو اور اسے دہرایا جائے۔ تو کیا ان آلاتی آوازوں کی اقتدا میں نماز کی جماعت کرنا جائز ہوگا؟"

ریڈیو پر ایک شخص کی امامت میں دور دراز کے مقامات کے لوگوں کا نماز پڑھنا یا گراموفون کے ذریعہ نماز کا ریکارڈ بنانا اور پھر کسی جماعت کا اس کی اقتدا میں نماز پڑھنا اصولاً صحیح نہیں ہے۔ اس کے وجوہ آپ غور کریں تو خود آپ کی سمجھ میں آسکتے ہیں۔

امام کا کام محض نماز پڑھانا ہی نہیں ہے بلکہ وہ ایک طرح سے مقامی جماعت کا رہنما ہے۔ اس کو اپنے مقام کے لوگوں سے شخصی ارتباط قائم کرنا، ان کے اخلاق، معاملات اور مقامی حالات پر نظر رکھنا اور حسب موقع وضرورت اپنے خطبوں میں یا دوسرے مفید مواقع پر اصلاح وارشاد کے فرائض انجام دینا چاہیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مسلمانوں کی دوسری چیزوں کے ساتھ اس ادارہ میں بھی اب انحطاط رونما ہو گیا ہے۔ لیکن بہرحال نفس ادارہ کو تو اپنی اصلی صورت پر قائم رکھنا ضروری ہے۔ اگر ریڈیو پر نمازیں ہونے لگیں یا گراموفون سے امامت وخطابت کا کام لیا جانے لگے تو امامت کی اصل رُوح ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی۔

نماز دوسرے مذاہب کی عبادتوں کی طرح محض پُوجا نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی امامت سے شخصیت کو خارج کر دینا اور اس میں "مشینیت" پیدا کر دینا دراصل اس کی قدر وقیمت کو ضائع کر دینا ہے۔

علاوہ بریں اگر کسی مرکزی مقام سے کوئی شخص ریڈیو یا گراموفون کے ذریعہ سے امامت وخطابت کے فرائض انجام دے اور مقامی امامتوں کا خاتمہ کر دیا جائے تو یہ ایک ایسی مصنوعی یکسانیت ہوگی جو اسلام کی جمہوری رُوح کو ختم کر دے گی اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ کو ترقی دے گی۔ یہ چیز ان نظامات کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہے جن میں پوری پوری آبادیوں کو ایک مرکز سے کنٹرول کرنے اور تمام لوگوں کو ایک لیڈر کا بالکلیہ تابع بنا دینے کا اصول اختیار کیا گیا ہے، جیسے فاشزم اور کمیونزم۔ لیکن اسلام ایک مرکزی امام یا امیر کے اقتدار کو ایسا ہمہ گیر بنانا نہیں چاہتا کہ مقامی لوگوں کی باگ ڈور بالکل اُس کے ہاتھوں میں چلی جائے اور خود ان کے اندر اپنے مفاد کو سوچنے، اپنے معاملات کو سمجھنے اور ان کو طے کرنے کی صلاحیت ہی نشوونما نہ پا سکے۔

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرن خیر القرون میں "امام" محض پجاری کی حیثیت نہیں رکھتے تھے جن کا کام چند مذہبی مراسم کو ادا کرا دینا ہو بلکہ وہ مقامی لیڈر کے طور پر مقرر کیے جاتے تھے۔ ان کا کام تعلیم وتزکیہ اور اصلاح تمدن ومعاشرت تھا اور مقامی جماعتوں کو اس غرض کے لیے تیار کرنا تھا کہ وہ بڑی اور مرکزی جماعت کی فلاح وبہبود میں اپنی قابلیتوں کے مطابق حصہ لیں۔ ایسے اہم مقاصد ریڈیو سیٹ یا گراموفون سے

کیونکر پورے ہو سکتے ہیں۔ آلات انسان کا بدل کبھی نہیں ہو سکتے، صرف مددگار ہو سکتے ہیں۔ ان وجوہ سے میں سمجھتا ہوں کہ "مشینی امامت" اسلام کی اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے۔

پیشۂ وکالت اسلامی نقطۂ نظر سے

"میں نے حال ہی میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا ہے، اور اس پیشہ میں خاصا کامیاب ہوا ہوں لیکن میں دیکھتا ہوں کہ ایک وکیل کو قوانین الٰہیہ کے برخلاف روزانہ قوانین انسانی کی بنا پر مقدمات لڑانے پڑتے ہیں۔ وہ اپنا پورا زور لگا کر اس چیز کو حق ثابت کرتا ہے جسے انسانی قوانین حق قرار دیتے ہیں خواہ خدائی قانون کی رو سے وہ حق ہو یا نہ ہو۔ اور اسی طرح باطل اسے ثابت کرتا ہے جو ان قوانین کی رو سے باطل ہے خواہ قانونِ الٰہی کے تحت وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔ گویا ایک وکیل بھی عدالت کے دروازے میں قدم رکھتے ہی معاً حق و باطل اور حقوق اور ذمہ داریوں کے اس معیار کو تسلیم کرتا ہے جس کو انسان کی خام کار عقل نے اپنی خواہشاتِ نفس کے ماتحت مقرر کر رکھا ہے۔ بوجھیکہ ایک وکیل کفر کی اچھی خاصی نمائندگی کے فرائض انجام دیتا ہے لیکن کوئی اور پیشہ بھی مجھے ایسا نظر نہیں آتا جسے اختیار کر کے آدمی نجاستوں سے محفوظ رہ سکے۔ اس دہری مشکل کا حل کیا ہے؟ میں یہ سوال اس مسافر کی طرح پوری آمادگیٔ عمل کے ساتھ کر رہا ہوں جو پابرکاب کھڑا ہو۔"

اپنے پیشہ کے متعلق آپ نے جو رائے قائم کی ہے وہ سو فی صدی صحیح ہے اور آپ کی سلامتِ طبع پر دلالت کرتی ہے۔ آپ جیسے سلیم الطبع لوگوں کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ ایک کافرانہ نظام جب کلی طور سے کسی سرزمین پر چھا چکا ہوتا ہے تو اس کے ماتحت رہتے ہوئے کسی شخص کا خالص حلال رزق حاصل کرنا اور مطابقِ شرع زندگی بسر کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ زیادہ حرام سے بچ کر کم حرام

اور ناگزیر حرام کو برداشت کیا جائے، اور بغاوت سے بچ کر ایسی معصیت کو مجبوراً گوارا کیا جائے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ وکالت کو آپ خود سمجھ چکے ہیں کہ یہ قانونِ الٰہی کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ اس کے مقابلہ میں اگر کسی دوسرے پیشہ میں کچھ حرام کی آمیزش ہو بھی تو بہر حال وہ بغاوت سے تو کم درجہ ہی کا گناہ ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، مزدوری، پرائیویٹ فرموں کی ملازمتیں اور اسی قسم کے دوسرے پیشوں میں ایسی صورتیں بہم پہنچ سکتی ہیں جن کے اندر کم سے کم ناگزیر معصیت کی حد پر آدمی قائم رہ سکتا ہے اور وہ کم از کم اس درجہ میں تو حرام نہیں ہیں جس درجہ کی یہ وکیلانہ بغاوت حرام ہے۔

عالمانہ جاہلیت

"ایک عالم دین اور صاحب دل بزرگ خطبات اور سیاسی کشمکش (جلد ۳) پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ملازمتیں غیر اللہ کی اطاعت کی تعریف میں نہیں آتیں۔ یہ تو اپنی اور اپنے اہل ملک کی خدمت ہے۔ یہ صد درجہ غلط طریق کار ہے کہ خزائن ارض پر ہندو اور سکھ بطور حاکم مسلط ہوں اور مسلمان شودر کی حیثیت میں صرف مطالبہ گذار بن کر رہ جائیں، اور ملازمت کریں بھی تو اس کی آمدنی کو حرام سمجھ کر کھایا کریں۔ میں حیران ہوں کہ ان کو کیا جواب دوں۔"

جن صاحب کے اعتراض کا آپ نے ذکر کیا ہے اگر ان کے متعلق آپ یہ نہ لکھتے کہ وہ عالم دین اور صاحب دل ہیں تو ان کے اعتراضات کو پڑھ کر میں اس کے بالکل برعکس رائے قائم کرنے پر مجبور ہوتا اور صبر کر لیتا، لیکن اب آپ سے یہ معلوم کر کے کہ وہ ماشاء اللہ دل اور دین دونوں رکھتے ہیں، ان کے یہ خیالات میرے لیے سخت حیرت کے موجب ہیں۔ علم رکھنے والے لوگ جب اس قسم کی باتیں کریں تو ان سے کوسوں دور رہنا چاہیے۔ بہکے ہوئے جاہلوں کو سمجھایا جا سکتا ہے، مگر بہکے ہوئے عالموں کو سمجھانے کی کوشش فضول ہے۔ جو کچھ میں لکھ چکا ہوں اس سے زیادہ اور کچھ لکھنا میرے بس میں نہیں ہے، اور اگر اس کو پڑھ کر بھی ان

لوگوں کا اطمینان نہیں ہوتا تو جس راستہ پر یہ چل رہے ہیں، اُسی پر چلے جائیں۔ مرنے کے بعد حقیقت ان پر بھی کُھل جائے گی اور مجھ پر بھی۔

(نوٹ) اس سے پہلے کے استفسار میں جو خیالات پیش کیے گئے ہیں ان کے بالمقابل ذرا ان خیالات پر بھی نگاہ ڈالیے۔ ایک طرف ایک جدید تعلیمیافتہ سیدھا سادہ مسلمان ہے اور دوسری طرف ایک عالم دین اور صاحب دل بزرگ۔ اس تقابل سے اندازہ کیجیے کہ جس گروہ کی امتیازی علامت ہی تقویٰ ہونی چاہیے وہ کیا انداز فکر رکھتا ہے اور تاویل کے ہتھیار سے کس طرح شریعت کی شہر پناہ میں رخنے پیدا کرتا ہے، اور دوسری طرف اس گروہ کو دیکھیے جو دہریت کی اس فضا میں جدید ناخدا آشنا تعلیم و تربیت کے زہراب سے پرورش پاتا رہا ہے، وہ دعوت حق کو کس آسانی سے سمجھتا ہے اور کتنے مضبوط تقویٰ کا ثبوت دیتا ہے۔

کاسبِ حرام کے ساتھ معاشی تعلقات کی حدود

"(۱) مشترک کاروبار جس میں صالحین و فاجرین ملے جلے ہوں، پھر فاجرین میں بائع خمر، آکلِ ربوٰ، وغیرہ شامل ہوں، اس میں شرکت کرنا کیسا ہے؟

(۲) کاسبِ حرام سے روپیہ قرض لے کر اس سے تجارت کی جا سکتی ہے یا نہیں؟

(۳) کاسبِ حرام کے ہاں نوکر رہنا یا اس کے ہاں سے کھانا پینا جائز ہے یا نہیں؟"

(۱) تجارت اگر بجائے خود حلال نوعیت کی ہو، اور جائز طریقوں سے کی جائے، تو اس میں کسی پرہیزگار آدمی کی شرکت محض اس وجہ سے ناجائز نہیں ہو سکتی کہ دوسرے شرکاء اپنا مال حرام ذرائع سے کما کر لائے ہیں۔ آپ کا اپنا سرمایہ اگر حلال ہے، اور کاروبار حلال طریقوں سے کیا جا رہا ہے، تو جو منافع آپ کو اپنے سرمایہ پر ملے گا، وہ آپ کے لیے حلال ہوگا۔

(۲) کاسبِ حرام سے قرض لے کر کام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

(۳) کاسبِ حرام کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک وہ جس کا پیشہ فحشاء کی تعریف میں آتا ہو، مثلاً زنان

بازاری کا کسب۔ اس کے قریب جانا بھی جائز نہیں، کجا کہ اس کے ہاں نوکر ہونا۔ دوسرا وہ کا سب حرام ہے جس کا پیشہ حرام تو ہے، مگر فحشار کی تعریف میں نہیں آتا جیسے وکیل یا سودی ذرائع سے کمانے والا۔ اس کے کسی ایسے کام میں نوکری کرنا جس میں آدمی کو خود بھی حرام کام کرنے پڑتے ہوں، مثلاً سود خوار کی سودی رقمیں فراہم کرنے کا کام، یا وکیل کے محرر کا کام، تو یہ حرام ہے۔ لیکن اس کے ہاں ایسے کام پر نوکری یا مزدوری کرنا جو بجائے خود حلال نوعیت کا ہو، مثلاً اس کی روٹی پکا دینا، یا اس کے ہاں سائیس یا ڈرائیور کا کام کرنا، یا اس کا مکان بنانے کی مزدوری، تو اس میں کوئی جرم نہیں۔ رہا اس کے ہاں کھانا کھانا، تو اس سے پرہیز ہی اولیٰ ہے۔

اسلام اور آلاتِ موسیقی

(۱) کیا آلاتِ موسیقی بنانا اور اُن کی تجارت کرنا جائز ہے؟

(۲) کیا شادی بیاہ کے موقع پر باجے وغیرہ بجانا جائز ہے؟ نیز تفریحاً ان کا استعمال کیسا ہے؟

(۳) اگر جواب نفی میں ہو تو ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے جو خود تو ان کا استعمال نہیں کرتے، لیکن ایسے تعلق داروں کے ہاں بخوفِ کشیدگی چلے جاتے ہیں جو آلاتِ موسیقی کا استعمال کرتے ہیں؟

(۴) کیا ہمارے لیے ایسے نکاح میں شامل ہونے کی اجازت ہے جہاں آلاتِ موسیقی کا استعمال ہو رہا ہو؟

(۵) آلاتِ لہو کے حامیوں کا خیال ہے کہ چونکہ آنحضورؐ کے زمانہ میں دف ہی ایک آلۂ موسیقی عرب میں رائج تھا، اور آپ نے اس کے استعمال کی اجازت دی ہے، لہٰذا ہمارے زمانہ میں دف کی اگر متعدد ترقی یافتہ شکلیں مستعمل ہو گئی ہیں تو ان کا استعمال کیوں ناروا ہو؟

(۶) کیا دف آلاتِ لہو میں شامل ہے؟

(۱) حدیث میں آتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں آلاتِ موسیقی توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں"۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو نبی اس کام کے لیے بھیجا گیا ہو اس کے پیرو انھیں آلات کو بنانے اور بیچنے اور بجانے کے لیے اپنی قوتیں استعمال کریں۔

(۲) شادی بیاہ ہو یا کچھ اور، باجے بجانا کسی حال میں درست نہیں۔

(۳) یہ محض ایمان کی کمزوری ہے۔ جو رسول اور اصحاب رسول کے ساتھ اپنا حشر چاہتے ہوں، ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ ایسے لوگوں سے ربط ضبط نہ رکھیں جنھیں احکامِ شریعت کی پروا نہیں۔ ورنہ جن کو ان لوگوں کے تعلقات زیادہ عزیز ہیں، انھیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ فاجرین اور صالحین کے ساتھ بیک وقت تعلق نہیں رکھا جا سکتا جب تمھاری دنیا فاجروں کے ساتھ ہے تو آخرت میں بھی انھیں کا ساتھ نصیب ہو گا۔

(۴) جواب ۳ ملاحظہ ہو مگر یہ خیال رہے کہ مجلس نکاح میں جبکہ ایجاب و قبول ہو رہا ہو اور منکرات و فواحش کی نمائش نہ ہو رہی ہو، شرکت کرنے میں مضائقہ نہیں۔ بلکہ اولیٰ یہ ہے کہ شرکت کی جائے اور جب موسیقی شروع ہو تو نہایت نرمی و شرافت کیساتھ یہ کہکر دوستوں اور عزیزوں سے رخصت چاہی جائے کہ جہاں تک تمھارے جائز کاموں کا تعلق ہے ہم تمھاری مسرت میں دل سے شریک ہیں اور جہاں تک ناجائز کاموں کا تعلق ہے ہم ان میں نہ خود شریک ہونا پسند کرتے ہیں نہ یہ گوارا کرتے ہیں کہ تم ان خرابیوں میں مبتلا ہو۔

(۵) یہ محض غلط ہے کہ دف کے سوا اُس زمانہ میں اور کوئی دوسرا آلۂ موسیقی نہ تھا۔ ایران اور روم اور مصر کی تمدنی تاریخ اور خود عربِ جاہلیت کی تمدنی تاریخ سے جو شخص جاہلِ محض ہو وہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ متعدد باجوں کے نام تو خود اشعارِ جاہلیت میں ملتے ہیں۔

(۶) دف کا نام اگر آلاتِ موسیقی میں شامل ہو بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ شادی بیاہ اور عید کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے اور یہ زیادہ سے زیادہ حد ہے جہاں تک رخصت دی جا سکتی ہے۔ اس آخری حد کو جو شخص نقطۂ آغاز بنانا چاہتا ہو اس کو آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ خواہ مخواہ اس نبی کے پیروؤں میں اپنا نام لکھوائے جو آلاتِ موسیقی توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہے؟

اشتراکیت کا مقابلہ

"اشتراکیت بری طرح نوجوانوں میں نشو و نما پانے لگی ہے۔ اس سلسلہ میں رہنمائی کی بڑی ضرورت ہے اگر آپ اس کے مقابلہ کی طرف توجہ کریں، اور اس کی تردید کے لیے قلم اٹھائیں، تو غالباً وقت کا ایک اہم تقاضا پورا ہو جائے گا۔"

اشتراکیت کے مقابلہ کی طرف مجھے توجہ ہے۔ سات آٹھ برس اس کے مطالعہ میں صرف کر چکا ہوں اور اس کے ساتھ اسلام کے معاشی نظام کو بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جس وجہ سے اب تک اس چیز پر براہ راست حملہ نہیں کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اشتراکیت کا مقابلہ محض ایک آدھ کتاب یا چند مضامین سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک تحریک ہے جو ۸۰، ۹۰ سال کے اندر بڑے ساز و سامان اور بڑی زبردست علمی تیاریوں کے ساتھ پرورش پا کر دنیا پر چھا گئی ہے۔ اس کا ایک پورا نظام فلسفہ ہے جس پر اخلاق، تمدن، معیشت، معاشرت، ادب، تعلیم، علوم طبیعی، غرض تمام شعبہ ہائے زندگی کے متعلق ایک ہمہ گیر "دین" کی عمارت قائم کی گئی ہے، اور پھر وہ کا غذی پر نہیں بنی ہے بلکہ ہزاروں لاکھوں ذہین، ذی علم، جفاکش اور ایثار پیشہ لوگوں نے سالہا سال کی محنتوں سے اس دین کو ایک تحریک کی شکل میں دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا ہے اور ایک وسیع خطۂ زمین میں اس کی بنیاد پر ایک نہایت طاقتور حکومت عملاً چلا کر دکھائی ہے۔ ایسی تحریک کا مقابلہ صرف ایک تحریک ہی کر سکتی ہے جس کی پشت پر ایک ایسی جماعت ہو جو علمی ہتھیاروں سے بھی مسلح ہو، کیرکٹر کی طاقت بھی رکھتی ہو عمل اور قربانی کے میدان میں بھی ٹکر لے سکتی ہو، اور پھر وہ اتنی تیار ہو کہ جس دین کو وہ دین مارکس کے مقابلہ میں لے کر اٹھے اس کی ترجمانی زندگی کے ہر شعبہ میں مارکسیوں سے زیادہ کامیاب علمی و عملی طریقوں سے کر سکے۔ اسی لیے میں نے اشتراکیت کے خلاف محض دل کی تسلی کے لیے کوئی کتاب یا مضمون لکھنے کے بجائے وہ پروگرام اختیار کیا ہے جسے آپ جماعت اسلامی کی تحریک کی صورت میں اس وقت عہد طفولیت سے گذرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ میں پوری قوت کے ساتھ نہ صرف دین مارکس بلکہ ہر دین باطل کے مقابلہ میں اترنا چاہتا ہوں اور اسی کی تیاری کر رہا ہوں اللہ مدد فرمائے۔

مطبوعات

ہیگل، مارکس اور اسلامی نظام | تالیف جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی، اے حیدرآباد دکن۔ صفحات ۲۴۰۔ قیمت بے جلد عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر رسالہ ترجمان القرآن، دار الاسلام، پٹھانکوٹ۔

اشتراکیت کا مطالعہ کرتے ہوئے عام تعلیم یافتہ لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اس کی عملی حرکت کو اس کے اعتقادی محرکات سے الگ کر کے دیکھتے ہیں، حالانکہ ہر عملی نظام کی طرح اشتراکی نظام میں بھی اصل چیز وہ افکار و نظریات ہیں جن پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اسی غلط طریق مطالعہ کی وجہ سے لوگوں کے لیے اشتراکیت کی بنیادی کمزوریوں کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ نوع انسانی کی معاشی و تمدنی ناہمواریوں کا بہترین علاج اشتراکی نظام ہے۔ صدیقی صاحب نے اس کتاب میں مارکسزم کا مطالعہ تنوں کے بجائے اس کی جڑ سے کر کے اس عام غلط فہمی پر ایک ضرب لگائی ہے۔ انھوں نے پوری مصنفانہ دیانتداری کے ساتھ اولاً ہیگل کے روحانی فلسفہ اضداد کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ پھر یہ دکھایا ہے کہ کس طرح یہ روحانی فلسفہ مارکس کے دماغی معمل میں پہنچ کر مادیت کے قالب میں ڈھل کر آپ اپنی ضد بن گیا۔ اس کے بعد مؤلف نے ان دونوں فلسفوں پر تنقید کر کے ان کی کوتاہ فکریوں کو نمایاں کیا ہے اور پھر اشتراکیت کے مقابلہ میں اسلامی نظامِ معاشی و سیاسی کا خاکہ پیش کر کے واضح کیا ہے کہ جن خرابیوں کی اصلاح کے لیے مارکس نے اشتراکی نظام تجویز کیا، ان کا سدباب اسلام نے اس سے بہتر طریقہ پر کر دیا ہے۔

کتاب علمی و تحقیقی انداز میں لکھی گئی ہے اور اردو لٹریچر میں اپنی راہ کا پہلا نقش قدم ہے۔ کمی اگر کچھ رہ گئی ہے تو یہ کہ اشتراکیت کے بنیادی افکار کا جتنا گہرا اور تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اتنا گہرا اور تفصیلی جائزہ اس کے عملی نظام کا نہیں لیا گیا۔ اس وجہ سے بحث و تنقید میں ایک بڑا خلا نظر آتا ہے جسے بھرنے کی ضرورت ہے۔ نیز اسلام

کے نظام معاشی کو جس حصہ میں پیش کیا گیا ہے اس میں بھی یہ کسر محسوس ہوتی ہے کہ اسلام کے اصولوں پر جدید عہد کے بڑے بڑے معاشی مسائل کو حل کر کے نہیں دکھایا گیا۔ مثلاً موجودہ بنکنگ سسٹم کو اڑا دینے کے بعد تجارتی وصنعتی کاروبار کو چلانے کے لیے کس نوعیت کے ادارے قائم کیے جا سکتے ہیں؟ مشین کے ذریعہ سے صنعت و تجارت میں جو مرکزیت پیدا ہو گئی ہے اس کے نقصانات کا علاج کیا ہے؟ مزدور، ملازم اور مزارع کے تحفظ کے لیے انتہائی تدابیر کیا ہو سکتی ہیں؟ وغیرہ۔ اس غرض کے لیے زکوٰۃ، عُشر اور تقسیم وراثت کے احکام مرتب کر دینا کافی نہیں بلکہ موجودہ دور کی معاشی زندگی کا پورا جائزہ لینا اور اصولِ اسلام میں اس کے مسائل کا تفصیلی حل تلاش کرنا ناگزیر ہے۔

امید ہے کہ صدیقی صاحب آئندہ ایڈیشن میں ان کمیوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

غایۃ البراعۃ فی معرفۃ علم البلاغۃ۔ الملقب بانوارِ عثمانیہ از جناب الحاج ابی النصر رحمۃ العلی خان اسامی، خطیب جامع سیکریالی، گجرات (پنجاب) صفحات ۳۱۲ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ مولوی رحمت علی خاں صاحب موضع سیکریالی، گجرات (پنجاب)

عربی زبان کے علمِ معانی پر جو لٹریچر موجود ہے اس سے استفادہ کر کے یہ کتاب لکھی گئی ہے اور غایۃ مؤلف کا مدعا یہ ہے کہ عربی کے معلمین و متعلمین متفرق کتابوں سے بے نیاز ہو کر اس ایک کتاب سے کام چلا سکیں اس لحاظ سے یہ ایک اچھی کوشش ہے اور درس نظامی کے طرز پر کام کرنے والی عربی درسگاہیں اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ مولف نے اس کتاب کی تالیف میں جدت سے قطعی احتراز کیا ہے اور متقدمین کے راستہ سے ایک انچ نہیں ہٹے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں عربی علم بلاغت پر قلم اٹھانے کے لیے ایک صاحب قلم کو جس لسانی استعداد کی ضرورت ہے، غالباً اس کا صحیح اندازہ حاجی صاحب کو نہیں تھا ورنہ غایۃ البراعۃ میں عربی الفاظ (مثلاً شجاعۃ) کا اردو تلفظ دیکھنے میں نہ آتا۔

کتاب العشر والزکوٰۃ از جناب مولانا عبد الصمد رحمانی صاحب۔ صفحات ۱۹۸ قیمت فی جلد ۴؍ روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ امارت شرعیہ، پھلواری شریف، ضلع پٹنہ (صوبہ بہار)

فریضۂ زکوٰۃ وعشر سے عام طور پر جو تساہل روا رکھا جاتا ہے اس نے مسلمانوں کی معاشی خستہ حالی کو دن دونی رات چوگنی ترقی دی ہے۔ پھر جو لوگ "نرمی طلبی سخن درین است" کہہ کر اپنی تجوریوں پر بخل کا قفل نہیں چڑھا لیتے ان کے صدقات بھی اجتماعی نظم کے فقدان کی وجہ سے پوری طرح مفید نہیں ہوتے۔ دراصل زکوٰۃ بھی نماز اور جہاد کی طرح ایک اجتماعی عبادت ہے اور امامت و جماعت کے ہونے کو مستلزم ہے۔ کتاب العشر والزکوٰۃ میں زکوٰۃ کی شرعی اہمیت اور اس کے لیے اجتماعی نظم کی ضرورت کو قرآن، حدیث اور فقہ سے اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔ اصول کے ساتھ فقہی جزئیات کو بھی سمیٹا گیا ہے۔ اس طرح زکوٰۃ وعشر کا پورا ضابطہ یکجا مرتب ہو گیا ہے۔ مگر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ استنباطی و اجتہادی اختلافات میں جناب مؤلف قارئین کو اپنی پسندیدہ رائے کی طرف بزور گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دولت عثمانیہ حصہ دوم ۔ مرتبہ جناب محمد عزیر صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ لکچرر مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ۔

ترکیہ اپنی جغرافی پوزیشن کی وجہ سے تاریخ سیاسیات میں جو اہمیت رکھتا ہے اور مسلمان سلطنتوں کے درمیان اس کی جو مخصوص حیثیت ہے اسے مدنظر رکھ کر یہ تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ جناب محمد عزیر صاحب نے اپنی کتاب کے اس دوسرے حصہ میں تاریخ ترکیہ کے وسیع مطالعہ کی مدد سے یہ دکھایا ہے کہ محمود ثانی ۱۸۰۸ء سے جنگ عظیم ۱۹۱۹ء تک کے عبوری دور سے ترک کس طرح گزرے ہیں اور روس، جرمنی، برطانیہ اور یونانی عیسائیوں کی دراندازیوں سے کس طرح سلطنت عثمانیہ سکڑتی گئی۔ خلافت عثمانیہ کی اس خوبی کو خوب نمایاں کیا ہے کہ اس نے مسلم و ذمی رعایا کو حقوق اور اصلاحات دینے میں مغربی ریاستوں کے مقابلہ میں ہمیشہ زیادہ فیاضی سے کام لیا ہے۔ اور یہی فیاضی اس کے لیے تباہی کی موجب ہوئی۔ مختلف تمدنی ادارات اور فنون کے ارتقار کی تاریخ کے ساتھ نظام حکومت کی ان تبدیلیوں کو بھی واضح کیا ہے جن کا خاتمہ قیام جمہوریت پر ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ "خلافت عثمانی" کی قبا میں لوکیت کا دیو خارجی قوتوں کے طبلوں کی تھاپ پر ناچ رہا تھا۔ جب ڈھول کا پول کھل گیا تو "چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا"۔ "اپنوں کی سادگی" اور "دوروں کی عیاری" سے شکست نہ کھا جاتی تو ترک حکومت الٰہیہ کو اس کی اصل

پر از سرِ نو قائم کر لیتے۔ لیکن ناسازگاری بخت سے انقلاب ترکیہ کی قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو تخلیقی ذہنیت سے محروم اور مغرب کی نقالی کے ماہر تھے۔ یہ لوگ فرنگ سے "لات و منات" اٹھا لائے اور انھیں اپنے کعبہ میں سجا کر یہ سمجھے کہ یہ نیا "رختِ حیات" ہے۔

"دولت عثمانیہ" کے مؤلف سے یہ شکایت بیجا نہ ہوگی کہ وہ محض ایک کیمرے کی طرح واقعات کی تفصیل جمع کرتے گئے ہیں۔ کتاب میں کوئی نمایاں مورخانہ زاویہ نظر کام کرتا نظر نہیں آتا۔ حالانکہ مسلمان کہلانے والی ایک قوم کی کارگزاری کی تاریخ لکھتے ہوئے ایک مسلمان کو یہ دکھانا چاہیے کہ اس نے اسلام کے مقتضیات کو کہاں تک پورا کیا اور کہاں وہ اپنے اجتماعی مسلک سے منحرف ہوئی اور اس انحراف نے اس کے نظام زندگی پر کیا اثرات چھوڑے۔ اصل میں ایک اصول یا معیار کو سامنے رکھ کر ناقدانہ تاریخ نویسی کا فن مسلمانوں کو ابھی تک آیا ہی نہیں اور جب تک یہ نہ ہوگا ہم اپنے مستقبل کی تاریخ کی صحیح تعمیر پر قادر نہ ہوں گے۔

رُوح القرآن | مرتبہ جناب محمد فیروزالدین صاحب، فیروز منزل، گجرات (پنجاب)۔ قیمت عہ۔

ملنے کا پتہ:- ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز اینڈ بک سیلرز، کشمیری بازار، لاہور۔

یہ کتاب دعوت قرآنی کا خلاصہ پیش کرتی ہے۔ مرتب نے کچھ عنوانات کے ماتحت قرآن کی بعض اہم آیات کا ترجمہ دیا ہے، توحید، نبوت اور معاد کے عقاید کا بیان ہے۔ عملی زندگی سے متعلق اوامر و نواہی مذکور ہیں۔ معمولی خواندہ لوگوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ | مرتبہ جناب عبداللہ بٹ صاحب، سیکرٹری آل پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن۔ لاہور۔

کاغذ، کتابت اور جلدبندی معیاری قیمت تین روپے۔

یہ ان اردو و انگریزی مقالات کا مجموعہ ہے جو "یوم شاہ اسمٰعیل شہیدؒ" کے سلسلہ میں بعض مشہور لکھنے والوں نے پیش کیے تھے۔ اس مجموعہ کی مدد سے ہندوستان کی اس مسلم تحریک کو سمجھنے میں کافی مدد مل سکتی ہے جو دہلی اور سرہند سے شروع ہوئی اور بالاکوٹ کے مدفن میں دفن ہوئی۔ بڑا ظلم تھا کہ تاریخ ہند سے اس زریں دور کو بالکلیہ ساقط کر دیا گیا

الحمد للہ کہ شہدائے بالاکوٹ کا خون اب رنگ لا رہا ہے۔

زیرِ تبصرہ مجموعۂ مقالات میں شاہ اسمٰعیل کی زندگی اور کارنامہ کے متعدد پہلو سامنے آگئے ہیں۔ مثلاً نواب نصیر الملک نے تحریک مجاہدین کی مختصر تاریخ کے شاہ صاحب کی سوانح اور تصانیف پر ضروری حد تک روشنی ڈالی ہے۔ تحریک کی ناکامی کے اسباب کا تعین بھی قریب قریب صحیح کیا گیا ہے۔ جناب پروفیسر عبدالقیوم صاحب نے شاہ صاحب کے تجدیدی کارنامہ کی وضاحت کے لیے ان کے نصب العین "حکومتِ الٰہیہ" کو بہت اچھی طرح نمایاں کیا ہے لیکن مضمون کے آخر میں اس نصب العین پر مسلم لیگ کی وضع کردہ اصطلاح پاکستان کا اطلاق کرکے اس کی اہمیت کو بہت کم کر دیا ہے۔ جناب ڈاکٹر تصدیق حسین خالد صاحب قومی و سیاسی نقطۂ نظر سے تحریکِ مجاہدین کے پس پردہ انگریزی اور اسلامی کلچر کی آویزش کا منظر دکھاتے ہیں۔ مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی نے تحریک کا سیاسی ماحول پیش کرنے کے بعد یہ واضح کیا ہے کہ شاہ صاحب کا اصل مقصد صرف پنجاب کو سکھوں کے تسلط سے نکالنا نہیں تھا بلکہ وہ انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ٹکر لے کر پورے ہندوستان کو دارالاسلام بنانا چاہتے تھے۔ یہ شکایت بے جا نہ ہوگی کہ مولانا سکھ حکومت کے "خلافتِ اسلام" ہونے کا بہت عالی اندازہ کرتے ہیں اور یہ دکھانے کی ناکام سی کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ شاہ صاحب کا اندازہ بھی ایسا ہی تھا حالانکہ اس دور میں "وطنی قومیت" کی وبا کا نام و نشان تک نہ تھا۔

نائب علام رسول صاحب مہر مدیر انقلاب بالاکوٹ کے آخری معرکہ کے سلسلہ میں بعض اہم سوال اٹھاتے ہیں۔ مثلاً حملہ مورخین کے بتائے ہوئے خفیہ راستہ سے ہوا تھا یا براہ راست مٹی کوٹ سے؟ سید احمد شہید علیہ الرحمۃ کی قبر شہادت گاہ سے ہٹ کر کیوں بنی ہوئی ہے؟ وغیرہ۔ ان سوالات کے سلسلہ میں مشہور اقوال کے ساتھ مہر صاحب نے اپنی رائے تو دے دی ہے مگر اس کے ساتھ گہری تاریخی تحقیق موجود نہیں ہے۔ بالخصوص جہاں رائے اجتہادی ہے وہاں تو یہ کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ جناب یوسف سلیم چشتی صاحب نے شاہ صاحب کے سیاسی ماحول کو پیش کیا ہے اور جناب نصراللہ خاں صاحب عزیز، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی و مرزا عبداللہ انور بیگ صاحب کے مضامین اجمالی اور تعارفی نوعیت کے ہیں۔

تعلیم القرآن | از جناب مولوی محمد عبدالرحیم صاحب۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ :۔ دارالاشاعت تفسیر تعلیم القرآن۔ قطبی گوڑہ جدید۔ حیدرآباد، دکن۔

اس تفسیری سلسلہ کے کچھ رسائل پر پہلے بھی ریویو ہو چکا ہے پیشِ نظر نمبر میں سورہ ممتحنہ کی تفسیر درج ہے

تعلیمات القرآن | مولفہ محترمہ عفت و صدیقہ۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ :۔ دارالاشاعت تفسیر تعلیم القرآن۔ قطبی گوڑہ جدید۔ حیدرآباد، دکن۔

یہ بھی "تعلیم القرآن" کے رنگ کی ایک تفسیری کوشش ہے جو جناب مولوی عبدالرحیم صاحب کی صاحبزادیوں کے جذبۂ خدمتِ قرآن کا نتیجہ ہے۔ اس میں عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق کے متعلق قرآن کی مختلف آیات کے سیدھے سادے مطالب بیان کیے گئے ہیں۔

تطہیر القلوب | از جناب الحاج سید صالح حسین صاحب شوق (علیگ) قیمت عہ، پتہ :۔ شاد بکڈپو، جہندرو، پٹنہ۔

یہ کتاب شیعہ حضرات کے بعض معروف اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی ہے، اور اس میں قرآن، حدیث، تاریخ اور کتبِ اہلِ تشیع سے استناد و استدلال کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس میں جانبدارانہ و انتہاپسندانہ رجحانات کا سُراغ بھی ملتا ہے اور واقعات پر بے لاگ تنقید کرنے سے پہلو تہی کی گئی ہے تاہم اسے غیر مفید نہیں کہا جاسکتا۔

رسالہ حقیقت التقویٰ یا معیار عبادت | از جناب مولانا تمنا عمادی مجیبی صاحب قیمت ۲ر، ملنے کا پتہ :۔ منیجر مکتبہ اسلامیہ، دار الادب۔ پھلواری شریف۔ (پٹنہ)

اس مختصر سے رسالہ میں اسلامی عبادات کی اصل روح یعنی "تقویٰ" کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔ آپ کا مدعا یہ ہے کہ عبادات کا ظاہری ڈھانچہ کھڑا کر لینا اخروی کامرانی کے لیے ناکافی ہے۔ اس ڈھانچہ کے اندر حقیقی اسپرٹ کارفرما ہونی چاہیے جو عبادات کے واسطہ سے پورے معاملات میں طاری و ساری ہو جائے۔

الدین القیم | از مولانا تمنا عمادی مجیبی صاحب۔ قیمت ۲ر۔ ملنے کا پتہ :۔ منیجر مکتبہ اسلامیہ، دار الادب۔ پھلواری شریف

اس رسالہ میں "الدین" کی حقیقت بیان کرتے ہوئے ایمان کے اساسی موضوعات پر نظر ڈالی گئی ہے جناب

مولف "انکارِ حدیث" کا مجددانہ مسلک رکھتے ہیں اس لیے ان کے "الدین القیم" میں اس مسلک کے جراثیم موجود ہونا کچھ عجب نہیں۔

جہالتِ کفرہ از جناب مولانا تمنا عمادی مجیبی صاحب۔ قیمت ۳/۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر مکتبہ اسلامیہ دارالادب پھلواری شریف (پٹنہ)

اس کتابچہ میں اسلام کی بنیادی صداقتوں کو اس طرز پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ عقل پرست ملحدین کو متاثر کیا جاسکے۔ بہت اچھی کوشش ہے مگر موجودہ ترقی یافتہ طرزِ استدلال کے لحاظ سے کوئی معیاری چیز نہیں ہے۔

ناقابلِ مصنف از جناب مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب مولوی فاضل امرتسری۔ قیمت ۱۰/۔ ملنے کا پتہ: دفتر اہلحدیث، امرتسر۔

اس کتاب میں مرزا غلام صاحب قادیانی کو بہ حیثیت مصنف پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پرانے طرزِ تنقید کے لحاظ سے تو شاید یہ کتاب کامیاب شمار کی جاسکتی ہو لیکن موجودہ عہد میں کسی شخص کے قلمی کارناموں کو پرکھنے کا جو فن مدون ہوچکا ہے وہ "ناقابلِ مصنف" کے مولف کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ اگر جدید طرزِ تنقید کے لحاظ سے مرزا صاحب کے تصنیفی کام کو پرکھا جائے تو شاید وہ اُس مقام سے بھی فروتر پائے جائیں جہاں تک مولانا ثناء اللہ صاحب نے انہیں پہنچایا ہے۔

طلوعِ سحر از جناب گویا جہاں آبادی صاحب۔ صفحات ۲۲۷ قیمت دو روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ:۔ نظامی پریس بک ایجنسی، بدایوں۔ (۲) کتابستان، الٰہ آباد۔ (۳) حمیدیہ بک ڈپو، پیلی بھیت۔

اس میں شک نہیں کہ شاعر کے مرکزی موضوعات فکر لا الٰہ الا اللہ، حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم اور واقعہ کربلا نہایت پاکیزہ موضوعات ہیں لیکن کمی یہ ہے کہ ان موضوعات کی وسعت کو خود شاعر نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری کی خیالی دنیا، واقعاتی دنیا سے بالکل علیحدہ نمبر ہوتی ہے۔ لطافتِ شعری اور فن کے نقطۂ نظر سے بھی کتاب مایوس کن ہے الا یہ کہ ورق گردانی سے چند پھڑکتے ہوئے اشعار مل جاتے ہیں۔

نورتن یا ایک ایکٹ کے ڈرامے | از علی عباس حسینی صاحب۔ ضخامت ۱۲۸ صفحات۔ قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، لکھنؤ۔

یہ ایک ایکٹ کے نو ڈراموں کا ایک مجموعہ ہے۔ پہلے چھ ڈرامے تاریخی ہیں۔ اُن میں پیش کردہ واقعات کتب تاریخ میں عام طور پر مذکور ہیں اور ہم میں سے ہر ایک شخص اُن سے واقف ہے۔ مؤلف نے پلاٹ کی ترکیب میں کہیں بھی کسی طرح کی ترمیم نہیں کی اور نہ ہی کردار کی سیرت میں کوئی خاص صحت یا تعمق پیدا کیا ہے جس سے بظاہر ہوتا کہ وہ اپنی طرف سے کوئی ذاتی نقطۂ نظر بھی پیش کر رہے ہیں۔ اس طرح ڈراموں کا یہ مجموعہ کسی تنقید و تبصرہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ سوائے اس کے کہ خود نفس واقعات پر کسی پہلو سے نگاہ ڈالی جائے۔ واقعات کے انتخاب میں اگر کوئی چیز مؤلف کے پیش نظر رہی ہے تو اس کا سمجھنا بھی ہمارے لئے مشکل ہے۔ آخری تین ڈرامے معاشرتی قسم کے ہیں۔ ان میں سے "سوانگ" دلچسپ اور عبرت آموز ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اونچی ذات کے ہندوؤں کے اچھوت دھار کے دعوے کس حد تک خلوص و صداقت پر مبنی ہیں۔

ضروری اطلاع

اس سال مارچ اور اپریل میں جماعت اسلامی کے حسب ذیل اجتماعات منعقد ہوں گے:۔ (۱) ۲۶ و ۲۷ مارچ ۱۹۴۵ء پنجاب، سندھ، بلوچستان و کشمیر کے ارکان کا اجتماع بمقام دارالاسلام (سرنا ریلوے اسٹیشن[1]) نزد پٹھان کوٹ۔ (۲) ۲۳ و ۲۴ اپریل ۱۹۴۵ء دہلی، یوپی، بھوپال اور وسط ہند کے ارکان کا اجتماع بمقام دہلی۔ (۳) ۲۸ و ۲۹ اپریل ۱۹۴۵ء حیدرآباد، مدراس اور بمبئی کے ارکان کا اجتماع بمقام حیدرآباد دکن۔

ہر حلقہ کے اجتماع میں حتی الامکان حلقۂ متعلقہ کے تمام ارکان شریک ہونے کی کوشش کریں۔ ان ہدایات کو پیش نظر رکھا جائے جو رجب و شعبان ۱۳۶۳ھ کے ترجمان القرآن میں اجتماع دربھنگہ کے موقع پر دی گئی تھیں۔ دعوت کے لئے "ترجمان" اور "مسلمان" کی شائع شدہ اطلاع کو کافی سمجھا جائے کسی عمومی خط کا انتظار نہ کیا جائے۔ جو حضرات شرکت کا ارادہ رکھتے ہوں وہ کم از کم ایک ہفتہ پہلے اطلاع دیدیں تاکہ موجودہ گرانی و کمیابی کے زمانہ میں مہمانوں کے انتظام میں زحمت پیش نہ آئے۔ صرف ارکان جماعت تشریف لائیں اور اپنے بستر ہمراہ لائیں۔

حلقۂ اول کے لوگ مرکز کو اطلاع دیں۔ حلقۂ دوم کے اصحاب عبدالجبار صاحب غازی، ہیڈ ماسٹر عریبک ہائی سکول دریا گنج، دہلی کو اطلاع دیں۔ اور حلقۂ سوم کے اصحاب محمد یونس صاحب، مکان ۱۰/۲۶۷ ملے پلی جدید، حیدرآباد دکن کو اطلاع دیں۔

[1] یہ اسٹیشن امرتسر پٹھانکوٹ برانچ لائن پر واقع ہے۔ گاڑیوں کے اوقات یہ ہیں:۔ (لاہور اور امرتسر سے بذریعہ لاری بھی آ سکتے ہیں)

	لاہور	امرتسر	سرنا
صبح:۔	۶ بجے	۸ بجے	۱۱ بجے
شام:۔	۶½ "	۸ "	۱۱½ "

رسائل و مسائل

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

یہ کتاب مولانا مودودی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ترجمان القرآن میں اسی عنوان کے تحت وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور اس میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل کا حل موجود ہے اس وجہ سے ان مضامین میں مولانا نے ہر طرح کے سوالات کے جوابات قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت مدلل اور مفصل طریق پر دیدئے ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کے لوگوں کے لئے جاذبیت کی حامل ہوگی۔

موضوعات مندرجہ ذیل ہیں

تفسیر آیات و تاویل احادیث	(۱۶)	مسائل کے جوابات
فقہی مسائل	(۳۴)	,,
خلافیات	(۱۵)	,,
عام مسائل	(۷)	,,
معاشی مسائل	(۱۵)	,,
سیاسی مسائل	(۱۰)	,,

ضخامت ۵۲۸ صفحات قیمت مجلد مع گرد پوش پانچ روپے چار آنے

اپنے شہر کے کتب فروشوں مقامی جماعت اسلامی کے مکتبوں

یا

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ۔ لاہور سے طلب کیجئے

سرورق رہبر پرنٹنگ پریس - بل روڈ ، لاہور میں چھپا